بیانِ شبلی (۲)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

بیان شبلی

(۲)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بیان شبلی

(۲)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۶

BAYAN-E-SHIBLI-2

By: Dr. Mohammad Ilyas Azmi
azmi408@gmail.com
+919838573645

Year of edition 2022
ISBN: 978-93-94616-23-3
₹ 350/-

کتاب : بیان شبلی ۔۲
مصنف : ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
باراول : اگست ۔۲۰۲۲ء
قیمت : ۳۵۰ روپے
صفحات : ۲۲۴
مطبع : روشان پرنٹرس، دہلی ۔۶

ملنے کے پتے

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

H.O. D1/16, Ansari Road, Darya Ganj, New Delhi-110002 (INDIA)
B.O. 3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 45678286, 23216162, 45678203, 41418204
E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com
website: www.ephbooks.com

تخلیقی نثر نگار

اور صاحب طرز ادیب

حقانی القاسمی

کی نذر

سیرۃ النبیؐ

''اگر مرنہ گیا اور ایک آنکھ بھی سلامت رہی تو ان شاء اللہ ایک ایسی کتاب
دے جاؤں گا جس کی توقع کئی سو برس تک نہیں ہو سکتی۔''

(علامہ شبلی نعمانی)

ترتیب

○○○

پیش گفتار

حافظ عمیر الصدیق ندوی
دارالمصنفین۔اعظم گڑھ

برادرم ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کی عمر جن ہندسوں کو چھو رہی ہے، ان کی کتابوں کا شمار غالباً ان ہی اعداد کے آس پاس ہے اور یقین کامل ہے کہ جلد ہی ان کی عمر، اپنی زندگی کی کاوشوں کو خود سے برتر ہوتا دیکھ لے۔

زیرنظر کتاب ان کی باونویں تصنیفی کاوش ہے، ظاہر ہے، ان کتابوں کے بارے میں بیسیوں اہل قلم کی تحریریں داد وتحسین کے جذبات کی ترجمان بن چکی ہیں، ایسے میں ایک ایسے قلم سے جس کے کشکول میں محض چند تحریری سکے ہوں، کیا خراج پیش کیا جاسکتا ہے۔

ہاں معاملہ الیاس صاحب کی محبت اور علامہ شبلی کی عقیدت کا ہو تو یہ سوچنا بجا ہے کہ کرامتیں عموماً جبہ و دستار کی کہانیوں کا حصہ ہوتی ہیں، لیکن علامہ شبلی نعمانی کی متاع زندگی پر نظر ڈال کر ان کی قدر و قیمت کا تعین روز اول سے جس طرح کیا گیا، اس کی بھی عجب شان ہے، علامہ جس دور کا عطیہ تھے وہاں کسی شخص کی زندگی میں اس کی محنتوں کا اعتراف اور اس کے فضل کا اقرار شاید زمانہ کی اخلاقیات میں مستحسن نہ تھا، لیکن اس کمی کے ہوتے ہوئے بھی علامہ شبلی نے زندگی ہی میں اپنے معاصرین سے اعتراف کمال کے باب میں اگر اپنی خوش نصیبی کا شمار کیا ہوگا تو یقیناً ان کی پیشانی سجدہ شکر میں رفعتوں کے ادراک کی لذت آشنا ہوئی ہوگی۔

شبلی کا نصیب بھی ایک موضوع ہوسکتا ہے، ایک جگہ مولانا عبدالماجد دریابادی کی مختصر سی

تحریر میں اس نصیب کا ذکر جس طرح مکرر ہوا ہے، اس کا پڑھنا بھی نصیب ہی کی بات ہے، مولانا لکھتے ہیں ''تنوع یا رنگا رنگی کی دولت شبلی ہی کے نصیب میں آئی۔ جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا، اب چاہے وہ چھوٹا سا مقالہ ہو یا بڑی سی کتاب، لکھنے کا حق ادا کر دیا۔ شبلی کو یکتائی تصنیف میں حاصل تھی''۔ (یہ بھی نصیب کی بات ہے) ''قلم پر قدرت وہ بھی ایسی ہمہ گیری، اس جامعیت کے ساتھ کمتر ہی کسی مصنف کے نصیب میں آئی ہے'' (پھر وہی نصیب والی بات) یہاں اتنا ہی نقل کرنا کافی تھا مگر جب ذکر شبلی کا ہو اور بیان دریا بادی کا تو تشنگی کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہتی اس لیے یہ بھی سن لیا جائے کہ شبلی اسلوب بیان کی باریکیوں کے اور لطافتوں کی نزاکتوں کے محرم راز تھے...... وہ اپنی تحریر میں خوددار اور مخلص تھے، وہی لکھتے جو ان کی فہم بصیرت میں آ چکا ہوتا، جسے ان کا ضمیر قبول کیے ہوئے ہوتا...... علمی مضامین ادا کرنے میں اور اسے حد کمال تک پہنچانے کا شرف شبلی ہی کے لیے اٹھ رہا تھا...... اب ان کے زمانہ کو بھی عرصہ گزرا، محاورے بدلے، ترکیبیں نئی نئی آئیں، لیکن شبلی کے طرز اسلوب پر اوس اب تک نہیں پڑنے پائی، وہی کس بل، وہی دم خم، تازگی لیے ہوئے وہی نمونہ، اب بھی خاصی بڑی حد تک محفوظ''۔

یہ جملے پڑھتے رہیے، ہر جملہ اپنے جلو میں ایک طویل تشریح کی تمنا رکھے ہوئے نظر آتا ہے۔

بات شبلی کے نصیب کی ہے، حقیقت یہ ہے کہ حیات شبلی، یادگار شبلی، ذکر شبلی، شبلی ایک دبستان، شبلی پر ایک نظر اور متعدد رسالوں کے شبلی نمبر، بظاہر کمیت کی کمی کا اشارہ کرتے ہیں لیکن کیفیت کے لحاظ سے یہ شہر شبلی کے روشن مینار ہیں جن کے آس پاس ہر دور میں شمعیں فروزاں ہوتی رہیں اور شبلی کی شخصیت جام جہاں نما کی مانند الگ الگ جلوے دکھاتی رہی، نئے نئے منظر سامنے آتے رہے اور دیکھنے والوں کو مسحور کرتے رہے۔

شبلی کا یہ نصیب ان کی شخصیت کے دوسرے اور پہلوؤں کی طرح سب سے جدا اور سب سے نمایاں بنتا رہا۔ خدا جانے کتنے مضامین، کتنے اشعار، کتنی تحقیقیں، کتنے حوالے، شبلی کے آس پاس گردش میں رہے۔ شبلی کو اپنے جہاں گیری ہونے پر ناز تھا، نصیبوں نے واقعی ان کو جہاں گیری

عطا کردی۔۱۹۱۴ء سے آج تک شاید ہی عالموں، ادیبوں، دانشوروں اور شاعروں کی کئی کئی نسلوں نے شبلی کے آفتاب علم سے اتنی روشنی اور حرارت اور ان کے ابر قلم سے اتنی سیری اور راحت پانے کا اعتراف کیا ہو۔شبلی کے بقول خود جہاں گیری اور ہماری سمجھ سے ان کی اس عالم گیری کے اسباب، تلاش کیے گئے اور آیندہ بھی وقت اس کے لیے وقف رہے گا، ایک وجہ تو مولانا سید سلیمان ندوی کی نظر میں یہ تھی کہ شبلی پر ایمان لانے والوں کا عقیدہ کمزور نہیں تھا، شبلی کی تمام تحریروں کو چھوڑیے، صرف ان کے خطوط اور ہزاروں خطوط پر ان دیکھا اور ان پڑھا ایمان ایسا تھا کہ وہ چند معلوم مکاتیب کو پڑھتے ہوئے یقین رکھتے تھے کہ جن کو نہیں پڑھا وہ بھی درجہ میں برابر ہی ہیں۔سچا مومن تو وہی جس کے نزدیک قرآن کی سب سورتیں برابر۔

بات تو شبلی کے نصیب کی تھی، جس نے پوری صدی کو شبلی کی عمل داری میں لا دیا، لیکن شبلی کا فیضان رکنے والا کہاں تھا، صدی کے ختم ہوتے ہوتے، شبلی کی ملت میں ایک مجدد نے ظہور کیا، جس نے اپنے لیے صرف ایک جزیرہ کا انتخاب کیا، ایسا جزیرہ جو شبلی کا تنہا اور کامل، جلوہ گاہ ثابت ہو۔دیکھتے دیکھتے اس جزیرۂ شبلی سے حیات شبلی کے سمندر کی ہر موج ٹکرانے لگی، نتیجے میں اس بحر کی تہہ سے خدا جانے کتنے ہیرے موتی اچھل کر جزیرے کو بیش بہا خزانے میں بدلنے لگے۔

جب الیاس صاحب کے قلم سے شروع میں شبلی پر چھوٹے چھوٹے مضامین آئے تو ان کے احباب اور ہم نشینوں کا کیا ذکر خود الیاس صاحب کے عالم خیال میں بھی یہ لمحہ نہیں گزرا ہوگا کہ یہ نوزائیدہ قلم ایک دن پچاسوں ضخیم اور وقیع کتابوں کے حق ملکیت کا تنہا دعویدار ہوگا۔ان کی کتابوں پر کتابیں آتی رہیں، مضامین نو کے انبار لگتے رہے اور نگاہیں خیرہ ہوتی رہیں کہ شبلی کی جہاں گیری کی تمام وسعتوں اور مدفون خزینوں کی یافت اور حصول کی یہ کون سی کنجی، ان کے ہاتھ لگی۔کوئی تو گوشہ چھوٹتا، جہاں شبلی کو ان کی آہٹ محسوس نہ ہوتی۔اب یہ شبلی کا فیضان ہے یا الیاس صاحب پر شبلی کے خالق کا احسان کہ جو کام کئی انجمنوں اور پچاسوں محققوں کے بس کا نہ تھا وہ شبلی کے ایک گوشہ نشیں نام لیوا سے لے لیا گیا۔سلام علی الیاسین۔

زیر نظر کتاب اس لیے ممتاز نہیں کہ یہ ذکر شبلی کے سلسلۃ الذہب کے معمول کا حصہ ہے۔

بیان شبلی کے نام سے اس کا پہلا حصہ آ چکا ہے، اب اس میں بھی شبلی کے تعلق سے نادر تحریروں کو جمع کیا گیا، یہ محض روایتی جملہ نہیں، اس جمع واخذ کے عمل میں محقق پر کیا گزرتی ہے، کوئی کیا بتائے؟ اخبار نیر اعظم، صحیفہ بجنور، آزاد اخبار ان ناموں کو کون جانتا ہے۔ ان کے نام ونشاں بھی ڈھونڈنے سے بہ آسانی نہیں ملتے، شبلی کو کون تلاش کرتا۔ لیکن بے مثال جستجو سے کیا نہیں ملتا۔ ایمان لانا ہو تو اس کتاب کو نگاہوں کے حوالے کرنا شرط ہے۔ نواب سراج الدین سائل نے کلام شبلی پر تضمینیں لکھیں، سائل تو خیر معروف ہیں لیکن یہ نور لدھیانوی کون؟ جنہوں نے شبلی کی شاہکار نظموں کی تضمینوں میں خود کو استاد ثابت کر دیا۔ خلیفہ عبدالحکیم کا دور خلافت، وراثت اقبال کا حصہ ہے لیکن شبلی پر ایک فلسفی قلم، شعر کی دنیا کا سفر کرے تو یہ خلافت سے زیادہ ولایت کی بات ہے۔

اس بیان شبلی -۲ میں بڑا حصہ علامہ شبلی پر تعزیتی تحریروں کے لیے خاص ہے، کمال ہے کیسے کیسے لوگوں اور انجمنوں کی تعزیتی تحریروں اور تقریروں کو یکجا کیا گیا، یکجا کیا کیا گیا؟ شبلی کی جہاں گیری پر یہ وقت کی دستاویزیں ہیں، نادر و نایاب مہروں کے ساتھ۔

ایسے خزانوں کی تلاش اور پھر حفاظت سے ان کی یکجائی محض برائے شوق نہیں، اس کے لیے قسام ازل جنون اور وارفتگی کی عطا و بخشش کا فیصلہ کرتا ہے، اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ الیاس صاحب کو شبلی کی طرح نصیب کی دولت ملی تو یہ کچھ مبالغہ نہیں، نہ یہ حیرت کی بات ہے۔

اس کتاب کا مقدمہ ہی حیرت کو دور کے لیے کافی ہے۔ یہ خود اعتمادی مسلسل محنت سے آتی ہے کہ مولف خود کہہ دے کہ ''یہ اپنے قیمتی اور گراں مایہ مطالعات وتحقیقات اور مشمولات کے سبب بیان شبلی کا حصہ دوم بھی بیش قیمت معلومات کا ذخیرہ ہو گیا ہے''۔

یقیناً بعض مشمولات تو ایسے ہیں جو معدومات میں تھے، شاید ہی کبھی کسی کو ان کی خبر ہوتی، شبلی کو شہید علم کہا گیا، مگر کیوں؟ اس کی وضاحت جس طرح کی گئی اس سے فاضل مولف کی شبلی شناسی پر واقعی مہر استناد لگ گئی۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ باونویں کو بیانویں میں بدل دے، الیاس صاحب کا جزیرہ شبلی، سیارہ شبلی بن جائے جس کے لیے صرف آسمان کی وسعتوں میں جگہ ہے۔

دیباچہ

سنہ ۲۰۲۰ء سے ۲۰۲۲ء تک علامہ شبلی نعمانی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] سے متعلق ناچیز کی کئی کتابیں منظر عام پر آئیں۔ان میں ''نقوش شبلی'' نے نسبتاً زیادہ مقبولیت پائی۔اس کا پہلا ایڈیشن محض چند ماہ میں ختم ہوگیا۔دوسرا ایڈیشن قلم فاؤنڈیشن لاہور نے شائع کیا۔اس کے بعد سلسلہ ''بیان شبلی'' کا حصہ اول شائع ہوا۔اورالحمدللہ توقع سے کہیں زیادہ اہل علم اور ارباب ذوق نے اس کی پذیرائی کی۔خاص طور پر قدردانان شبلی نے بے حد حوصلہ افزا کلمات سے نوازا۔شوق کے ہاتھوں لیا اور ذوق کی نگاہوں سے پڑھا۔چونکہ ''بیان شبلی'' اول کے دیباچہ میں ضمناً یہ ذکر آ گیا تھا کہ بیان شبلی مطالعہ شبلی کا ایک غیر موقت سلسلہ ہے اوران شاءاللہ آیندہ وقتاً فوقتاً اس کے دوسرے حصے شائع ہوتے رہیں گے، اس لئے قدردانان شبلی اس کے دوسرے حصوں کے متعلق استفسار کرتے رہے اور راقم الحروف دوسرے کاموں کی تکمیل میں ہمہ تن مصروف رہا اوراس کی طرف خاطر خواہ توجہ نہ کرسکا۔اس دوران متعدد علمی وتحقیقی کتابیں پایہ تکمیل کو پہنچیں اور مختلف اداروں سے شائع ہوئیں۔ ان میں ''مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں علامہ شبلی کا حصہ'' اور ''خطبات شبلی۔ نودریافت'' دارالمصنّفین کی طرف سے شائع ہوئیں۔اسی عرصہ میں ''مکتوبات شبلی'' کا نیا اضافہ شدہ ایڈیشن بھی دارالمصنّفین سے منظر عام پر آیا جس میں علامہ شبلی کے ۷۳۱ رخطوط مع تعلیقات و حواشی شامل ہیں۔ علاوہ ازیں ایک اور نہایت اہم کتاب ''تصانیف شبلی کے تراجم'' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی کی جانب سے شائع ہوئی۔

مطالعہ شبلی میں علامہ شبلی کے مکاتیب کی بڑی اہمیت ہے۔اس سلسلہ کی جو اہم کتابیں شائع ہوئیں مثلاً حیات شبلی (مولانا سید سلیمان ندوی)، یادگار شبلی (شیخ محمد اکرام) شبلی کا ذہنی ارتقا (سید سخی احمد ہاشمی)، شبلی مکاتیب کی روشنی میں (معین الدین انصاری) اور شبلی کی آپ بیتی (ڈاکٹر خالد ندیم) سب مکاتیب شبلی ہی کے گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔اس لئے ضرورت ہے کہ ''مکتوبات شبلی'' ہی کی طرح ''مکاتیب شبلی'' کی دونوں جلدوں کو بھی مع تعلیقات وحواشی شائع کیا جائے۔اس سلسلہ کا ایک انتہائی اہم اور مفید کام ''کلیات مکاتیب شبلی'' کی تدوین وترتیب اور اشاعت ہے جو برسوں سے معرض التوا میں ہے۔خدا اس کی تکمیل واشاعت کی توفیق بخشے۔

علامہ شبلی کی کتاب زندگی کا ایک اہم باب انجمن ترقی اردو سے متعلق ان کی خدمات ہیں۔دراصل وہ انجمن ترقی اردو کے بانی سکریٹری تھے۔اس حیثیت سے انہوں نے انجمن اور اردو ادب کی جو بیش بہا خدمات انجام دیں اور جو نہایت اہم اور قابل ذکر ہیں۔چنانچہ ناچیز نے اس کے مطالعہ و جائزہ سے دلچسپی لی اور ایک کتاب ''علامہ شبلی اور انجمن ترقی اردو'' سپرد قلم کی، جسے مغربی بنگال اردو اکیڈمی کولکاتا نے شائع کیا ہے۔اس کی اشاعت میں ہمارے کرم فرما ڈاکٹر دبیر احمد صاحب صدر شعبہ اردو مولانا آزاد کالج کولکاتا نے بڑی دلچسپی لی،اس ذرہ نوازی کے لئے موصوف کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔

یہ کتابیں اگر چہ گذشتہ سال یکے بعد دیگرے شائع ہوئیں،لیکن یہ ناچیز کے برسوں کے مطالعہ وتحقیق کا نتیجہ ہیں۔بلاشبہ ان سے ذخیرہ شبلیات میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔یہاں ان کا ذکر محض تحدیث نعمت کے طور پر کیا گیا ہے:

ایں سعادت بزور باز ونیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

بیان شبلی حصہ دوم کی اشاعت میں تاخیر کا ایک سبب مذکورہ تصنیفات کی اشاعت بھی ہیں۔
مذکورہ کتابوں کے علاوہ ناچیز نے متعدد علمی،ادبی،تنقیدی اور تحقیقی مقالات بھی سپرد قلم کئے تھے جو ہند و پاک کے نہایت موقر رسائل اور تحقیقی مجلّات مثلاً معارف اعظم گڑھ، ماہنامہ

ایوان اردو دہلی، ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ، سہ ماہی مجلّہ فکر ونظر علی گڑھ، ماہنامہ قومی زبان کراچی اور ماہنامہ الزبیر بہاول پور وغیرہ میں شائع ہوئے۔ جن کا ایک مجموعہ ''افادات شبلی'' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے اسی سال شائع ہوا ہے۔ اب دوسرا مجموعہ ''بیان شبلی'' حصہ دوم شائع کیا جا رہا ہے۔ اس حصہ کے مقالات میں بھی بڑا تنوع اور جامعیت ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ ان میں بھی علامہ شبلی کے کی حیات وخدمات کے بعض نئے گوشے سامنے آئے ہیں۔

اس حصہ میں گیارہ مقالات شامل ہیں۔ پہلا مقالہ علامہ شبلی کے فارسی خطوط سے متعلق ہے جو دراصل میری کتاب ''علامہ شبلی کے فارسی خطوط: ایک مطالعہ'' کا افتتاحیہ ہے۔ دوسرے مقالہ میں ''شعرالعجم'' کے ایک باب ''بیان خسرو'' کو جسے خواجہ حسن نظامی نے درویشانہ ادب کے تحت شائع کرایا تھا، اس کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اس دور کے رسائل نے ''بیان خسرو'' کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا تھا انہیں بھی تعارف میں شامل کیا گیا ہے۔ اس میں ''بیان خسرو'' سے متعلق متعدد نادر تحریریں شامل ہیں جو ملا واحدی کی ادارت میں شائع ہونے والے ماہنامہ ''نظام المشائخ'' دہلی سے دستیاب ہوئی ہیں۔ ان سے ''بیان خسرو'' کی اہمیت اور افادیت کے ساتھ اس سے اہل علم کی دلچسپی کا بھی اظہار ہوتا ہے

علامہ شبلی کا ایک بڑا کارنامہ ماہنامہ الندوہ کی ادارت بھی ہے۔ ۱۹۰۴ء سے ۱۹۱۲ء تک علامہ شبلی اس کے مدیر رہے۔ ان کی زمانہ ادارت کے ماہنامہ الندوہ کے تمام شمارے دارالمصنفین نے نو جلدوں میں شائع کر دئے ہیں۔ ماہنامہ الندوہ سے متعلق علامہ شبلی کے ایک عزیز شاگرد مولانا ظفر علی خاں کی ایک قدیم تحریر ہاتھ آ گئی تو اسے بھی موضوع کی مناسبت سے تعلیقات وحواشی کے ساتھ شامل کر دیا گیا ہے۔

علامہ شبلی کے کلام کی مقبولیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ان پر تضمین ان کے عہد میں بھی کی گئی اور بعد میں بھی یہ سلسلہ قائم رہا۔ نواب سراج الدین خاں سائل دہلوی اور نور لدھیانوی نے ان کی کئی نظموں پر تضمین کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بعض تضمین بڑی خوب صورت ہیں۔ ان میں چند تو اس قدر خوب عمدہ ہیں کہ ان پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ ان کے بارہ میں صحیح رائے تو قومی کونسل

برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے موجودہ ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد صاحب ہی دے سکتے ہیں کہ یہ ان کا میدان ہے اور وہ اس موضوع پر دادِ تحقیق و تصنیف دے چکے ہیں۔ ان کی کتاب کا نام ''فن تضمین نگاری: تنقید و تجزیہ'' ہے۔ اسے ساقی بک ڈپو دہلی نے ۲۰۰۱ء میں شائع کیا ہے۔ البتہ ڈاکٹر صاحب موصوف کی کتاب نقش اول ہے۔

گذشتہ سال خطہ اعظم گڑھ کی قدیم دینی درس گاہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کی انجمن طلبہ قدیم نے ایک سمینار کا انعقاد کیا تھا، جس میں مدرسہ کی تاریخ اور خدمات جلیلہ پر مقالات پیش کئے گئے۔ راقم الحروف کے ذمہ ''علامہ شبلی اور مدرسۃ الاصلاح'' کا عنوان تھا۔ ناچیز اگرچہ اس سمینار میں شریک نہیں ہوسکا، تاہم دیر سے سہی مقالہ لکھنے میں کامیاب رہا۔ وہ مقالہ بھی اس کتاب کا حصہ ہے۔

علامہ شبلی نے ۱۹۱۴ء میں وفات پائی۔ اس وقت پروفیسر خلیفہ عبدالحکیم سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں بی اے کے طالب علم تھے۔ اس سانحہ پر انہوں نے ایک بڑی غم انگیز نظم لکھی تھی جو زمیندار لاہور میں شائع ہوئی ہے۔ وہ نادر نظم بھی زیر نظر حصہ میں شامل کی گئی ہے۔ یہ نظم پروفیسر خلیفہ عبدالحکیم کے مجموعہ ''کلام حکیم'' میں بھی شامل نہیں ہے۔ پروفیسر خلیفہ عبدالحکیم کی کاوشوں کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے یہ نظم گویا ایک تحفہ ہے۔ ان کی علامہ شبلی سے گہری دلچسپی سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہیں فلسفہ و کلام سے کیونکر دلچسپی پیدا ہوئی۔

ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کی مختلف مجالس میں علامہ شبلی نعمانی کو منظوم و منثور سپاس نامے پیش کئے گئے۔ ایک مقالہ میں ان کا ذکر ہے۔ علاوہ ازیں ایک مقالہ میں نامور محقق رشید حسن خاں کی شبلی شناسی کا قدرے تفصیل سے ذکر و مطالعہ شامل ہے۔

کتاب کا آخری مقالہ ''وفات شبلی پر ماتم'' ہے۔ اسے گرامی قدر جناب ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی مدظلہ مدیر مسئول ماہنامہ الرشاد اعظم گڑھ نے پسند فرمایا اور اس کا کچھ حصہ ماہنامہ الرشاد میں بالاقساط شائع کردیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ علامہ شبلی نعمانی جیسی خالص علمی شخصیت کو کس درجہ مقبولیت اور محبوبیت حاصل تھی اور ان کی وفات پر ملک کا اہل علم اور

دانشور طبقہ کس طرح رویا اور مضطرب ہوا۔ اور اس نے کیسے کیسے الفاظ میں ان کی تعزیت کی اور انہیں خراج عقیدت پیش کیا۔ اس مقالہ کے لکھنے کا ایک خاص مقصد مطالعات شبلی کی اولین اور غیر معروف تحریروں سے قدر دانان شبلی کو واقف کرانا بھی ہے۔

شبلی شناسی کے اولین نقوش کی جمع و تدوین کا سہرا ممتاز محقق ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کے سر ہے۔ ان کی کتاب ''شبلی شناسی کے اولین نقوش'' دارالمصنّفین سے شائع ہوچکی ہے۔ زیرنظر کتاب میں شامل طویل مقالہ کی متعدد تحریریں بلاشبہ اس میں قیمتی اضافہ ہیں۔ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی مرحوم ہوتے تو ان اضافات پر بہت خوش ہوتے۔

اس مقالہ میں ایک ناشائستہ وفیاتی تحریر بھی شامل ہے جو ایک بڑے اہل حدیث عالم مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ کے قلم سے ان کے ماہنامہ اہل حدیث میں شائع ہوئی ہے۔ اس تحریر سے مخالفین شبلیؒ کے بعض خیالات اور تکلیف دہ انداز بھی سامنے آتے ہیں۔ اس کے تجزیے کی چنداں ضرورت نہیں تھی، اس لئے اسے محض نقل کر دیا گیا ہے۔ اس پر کسی قسم کا تبصرہ نہیں کیا گیا ہے۔ البتہ اس کے برعکس بھی چند اہم تحریریں اس مقالہ میں شامل ہیں۔ جیسے امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کا وفیاتی نوٹ، جس میں ان کے جذبات و احساسات کا ایک دریا موجزن ہے اور جس میں انہوں نے علامہ شبلی کو ''شہید علم'' قرار دیا ہے۔ شہید علم کی حیثیت سے ابھی تک علامہ شبلی کا مطالعہ و تجزیہ پیش نہیں کیا جاسکا ہے۔ راقم کا خیال ہے کہ اس قدر مصروف علمی زندگی ان کے کسی معاصر نے نہیں گذاری۔ اور نہ کسی نے اتنا وقیع علمی، ادبی، تعلیمی اور فکری سرمایہ قوم کی نذر کیا ہے۔

ان کے علاوہ بھی اس مقالہ میں متعدد نادر و نایاب اور کم یاب تحریروں کو جگہ دی گئی ہے۔ اس میں محمد امین زبیری کی وفیاتی تحریر بھی شامل ہے۔ علامہ شبلی سے متعلق بعض نادر قطعات تاریخ، لوح مزار اور مسدس وغیرہ کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ شعرا میں علامہ اقبال، اکبر الہ آبادی، عزیز لکھنوی، مولوی سید علی زینبی سابق استاذ دارالعلوم ندوہ اور مولوی سید ابن علی محشر وغیرہ کی تخلیقات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

غرض اپنے قیمتی اور گراں مایہ مطالعات وتحقیقات اور مشمولات کے سبب بیان شبلی کا یہ

حصہ دوم بھی بیش قیمت معلومات کا ذخیرہ ہو گیا ہے۔ اللہ تعالی اسے شرف قبولیت بخشے۔

تلاش و تفحص اور تحقیق و تدوین کا کاروان اردو روز بروز ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ تحقیق کی پہلی منزل تلاش و تفحص ہے۔ بلاشبہ اس کتاب میں تلاش و تفحص کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا ہے۔ البتہ یہ دعویٰ بھی نہیں کیا جا سکتا کہ تحقیق کا حق ادا کر دیا گیا ہے۔ اس لئے اہل علم سے گذارش ہے کہ اغلاط سے صرف نظر نہ کیا جائے۔ اور ان سے ناچیز کو واقف کرایا جائے۔

''بیان شبلی'' حصہ دوم میرے سلسلہ مطالعات شبلی کی چوبیسویں اور عام تصنیفات کے سلسلہ کی باونویں کتاب ہے۔ امید نہیں یقین واثق ہے کہ یہ سلسلہ ابھی اور دراز ہوگا۔ دراصل یہ ناچیز تصنیف و تالیف کو معراج کمال تصور کرتا ہے۔ ۳۵؍ برس پہلے طالب علمانہ قلم جو ہاتھ میں آیا تو ناچیز نے پیچھے مڑ کر نفع و نقصان کی جانب نہیں دیکھا۔ حالانکہ ہزاروں جلوے نگاہوں میں آئے۔ متعدد احباب عہدہ و منصب میں کہاں سے کہاں پہنچے اور کیا کچھ بنے، مگر اس بے مایہ نے کبھی اس پر نگاہ نہیں کی۔ دراصل یہ سب میرے رب کا فضل و کرم ہے کہ اس نے تصنیف و تالیف کی دولت عطا کی۔ ہاں والدین اور بزرگوں کی دعائیں ضرور ہر لحظہ ساتھ رہی ہیں۔

بیان شبلی حصہ دوم کی تکمیل پر میں اپنے پروردگار اور خالق کائنات کے سامنے سجدہ ریز ہوں کہ اس کی مرضی کے بغیر کوئی کام پورا نہیں ہو سکتا۔

استاذ گرامی ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی صاحب ڈپٹی ڈائرکٹر دارالمصنّفین کی شفقتیں میرے علمی، تعلیمی اور تصنیفی سفر میں روشنی بن کر رہنمائی کرتی رہی ہیں اور آج بھی ان کا سایہ شفقت میری ایک بڑی قیمتی متاع ہے۔ اللہ تعالی ان کا سایہ شفقت دراز فرمائے۔ گرامی قدر جناب شکیل رشید صاحب مدیر ممبئی اردو نیوز کا شکریہ ادا کرنا بھی ہے۔ ان کی بدولت میری تصانیف کا آوازہ ایک بڑے حلقہ تک پہنچ جاتا ہے۔ کتاب کا اشاریہ حسب معمول عزیز مکرم مولانا محمد عرفات اعجاز اعظمی سلمہ اللہ تعالیٰ نے مرتب کیا ہے اور محنت و سلیقہ سے مرتب کیا ہے۔ اس سے کتاب کی افادیت دو چند ہو گئی ہے۔ میں ان کا بھی ممنون احسان ہوں۔

برادرم مولوی سلیم جاوید ناظر کتب خانہ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ ایک مدت سے

حق برادرانہ ادا کرتے رہے ہیں۔ان کی محبت لائق رشک ہے۔میں ان کا ذکر کبھی کرتا ہوں اور کبھی بھول جاتا ہوں،مگران کی محبت کبھی کم نہیں ہوئی۔وہ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کے سابق ناظم اور نامور اہل قلم مولانا ضیاءالدین اصلاحی کے چھوٹے صاحبزادے ہیں۔شرافت،وضع داری اور علم دوستی انہیں وراثت میں ملی ہے۔اللہ تعالی انہیں دین و دنیا کی کامرانیوں سے ہم کنار کرے۔ ان کے علاوہ متعدد احباب واشخاص اور اہل خانہ نے میرا تعاون کیا اور پذیرائی کی۔میں ان سب کا شکر گذار اور ممنون ہوں۔

آخر میں برادر گرامی ادیب شہیر مولانا حافظ محمد عمیر الصدیق ندوی دریابادی کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض خیال کرتا ہوں کہ انہوں نے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی ہے۔اس مجموعہ کو بھی نہ صرف زبانی لائق اشاعت قرار دیا اور حوصلہ افزا کلمات کہے بلکہ یہی باتیں خوب صورت نثر میں لکھ کر کتاب کی افادیت میں ایک نہایت خوب صورت اضافہ کیا ہے۔جزاک اللہ خیرا۔

ناچیز
محمد الیاس الاعظمی
شائستہ منزل،شہر اعظم گڑھ

۱۱رجون ۲۰۲۲ء

•••

[۱]

علامہ شبلی کے فارسی خطوط

علامہ شبلی ایک نابغہ روزگار شخصیت تھے۔ان کا ادبی سرمایہ ہمارے ذخیرہ ادب کی بڑی قیمتی متاع ہے۔اس کی حیثیت نگینوں سے کم نہیں۔اس کی اہمیت اورافادیت پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔اس کا ایک اندازہ کتابیات شبلی کے مشمولات سے لگایا جاسکتا ہے۔

علامہ شبلی کا سرمایہ ادب جو دراصل سرمہ ادب ہے، تین زبانوں اردو عربی اور فارسی پر محیط ہے۔ان کا پہلا رسالہ''**اسکات المعتدی علی انصات المقتدی**'' اورآخری تصنیف ''**الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی**'' عربی زبان میں ہیں۔علاوہ ازیں عربی میں سات خطوط بھی دستیاب ہیں،جنہیں''مکاتیب شبلی'' حصہ دوم میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح فارسی زبان وادب پر انہیں بے پناہ دست رس حاصل تھی۔اس کا بہترین نمونہ تو پانچ جلدوں میں''شعرالعجم''ہے،لیکن کلیات فارسی بھی شائع ہو چکا ہے۔فارسی غزلوں کے مجموعے دستہ گل، بوئے گل اور برگ گل بھی ان کے فارسی زبان پر زبردست عبور کے نمونے ہیں۔ خطوط اور بعض دیگر تحریریں بھی فارسی میں طبع ہو چکی ہیں،لیکن ان کی تمام معرکہ آرا تصنیفات اردو زبان میں ہیں۔ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں،لیکن اس قدر ضرور کہا جاسکتا ہے کہ علامہ شبلی کے سرمایہ علمی میں بڑا تنوع اور طرفگی ہے۔

علامہ شبلی کے مکاتیب کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔ان کی تفصیل اس طرح ہے:

۱۔مکاتیب شبلی حصہ اول۔مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ،۲۰۱۰ء

۲۔مکاتیب شبلی حصہ دوم،مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ،۲۰۱۲ء
۳۔خطوط شبلی ۔مرتبہ منشی محمد امین زبیری،ظل السلطان بک ایجنسی بھوپال
۴۔خطوط شبلی بنام آزاد۔مرتبہ سید محمد حسنین، بہار اردو اکادمی پٹنہ،۱۹۸۸ء
۵۔مکتوبات شبلی ۔مرتبہ محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۱۳ء
۶۔مراسلات شبلی ۔مرتبہ محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ،۲۰۱۶ء

ان تمام مجموعہ ہائے مکاتیب میں علامہ شبلی کے کل ۱۲۲۲/خطوط شامل ہیں۔ان میں پانچ مکتوب الیہ کے نام چھ عربی خطوط اور دس اشخاص کے نام ۳۳/فارسی خطوط بھی شامل ہیں جنہیں مولانا سید سلیمان ندوی[۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] نے ''مکاتیب شبلی'' حصہ دوم میں عربی خطوط سے پہلے درج کیا ہے۔یہاں مکتوب الیہ کے نام اور خطوط کی تعداد درج کی جاتی ہے:

۱۔	شیخ حبیب اللہ	۲۔خطوط
۲۔	شیخ عجیب اللہ	۱۔خط
۳۔	حافظ مسٹر مہدی حسن	۳۔خطوط
۴۔	مولوی حکیم محمد عمر	۳۔خطوط
۵۔	مولانا حمید الدین فراہی	۲۔خطوط
۶۔	مولوی محمد عمر	۸۔خطوط
۷۔	مولوی محمد سمیع	۱۱۔خطوط
۸۔	اکبر صاحب	۱۔خط
۹۔	فرحت احمد	۱۔خط
۱۰۔	ہز ہائینس آغا خان	۱۔خط
•	میزان	۳۳۔خطوط

یہ خطوط علامہ شبلی نعمانی کے عہد شباب کی یادگار ہیں۔وہ ۲۵/سال کی عمر میں فروری ۱۸۸۳ء میں ایم اے او کالج علی گڑھ سے بحثیت فارسی پروفیسر اور اسسٹنٹ عربی پروفیسر وابستہ

ہوئے۔اس سے پہلے ان کے خطوط کی زبان فارسی تھی۔اس عرصہ میں انہوں نے جتنے خطوط لکھے ہیں وہ سب فارسی میں ہیں۔علی گڑھ سے وابستگی کے بعد ان کی زبان اردو ہوگئی۔اگرچہ بعض خطوط اس کے بعد بھی فارسی میں لکھے،لیکن درحقیقت علی گڑھ جا کر یہ سلسلہ تقریباً ختم ہوگیا۔اور فارسی کی جگہ اردو نے لے لی۔

علامہ شبلی نعمانی فارسی خطوط اہتمام سے لکھا کرتے تھے۔اور احباب سے انہیں محفوظ رکھنے کی درخواست بھی کیا کرتے تھے،جیسا کہ ان کے بعض خطوط سے معلوم ہوتا ہے۔جب کوئی خط دلچسپ ہوجاتا تو اسے احباب و متعلقین کو دکھانے اور پڑھانے کی بھی تلقین کرتے تھے۔اس زمانہ میں ان پر فارسی کا ایسا نشہ تھا کہ اردو میں لکھنا بھی عار سمجھتے تھی۔''سیرۃ النعمان'' کے منظوم دیباچہ میں فرماتے ہیں:

گرچہ مراشیوۂ فن ایں نہ بود
حرف بہ اردو زدن آئیں نہ بود

مگر مرزا غالب[۱۷۹۷-۱۸۶۹ء] کی طرح ان کے اردو کلام اور اردو مکاتیب ہی نے علامہ کو بھی بقائے دوام کی دولت سے سرفراز کیا۔کلیات شبلی اردو اور اردو مکاتیب شبلی نے بڑی مقبولیت پائی۔ایک نقاد نے تو ان کے اردو مکاتیب کو قومی اعمال نامہ قرار دیا ہے۔اور بلاشبہ ان کے خطوط میں نہ صرف اس عہد کا ہندوستان زندہ و تابندہ نظر آتا ہے بلکہ عالم اسلام کی سرگرمیوں کی اطلاع بھی فراہم ہوتی ہے۔ہندوستان میں ملک وملت کا شاید ہی کوئی ایسا قابل ذکر پہلو ہو جو اس میں مضمر نہ ہو۔بالخصوص تعلیم اور متعلقات تعلیم اور ان کی علمی و ادبی تصنیفی سرگرمیوں کا ان خطوط سے مکمل احاطہ کیا جاسکتا ہے۔ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ واقعی ان کے خطوط قومی اعمال نامہ ہیں، لیکن باوجود اہتمام کے یہ خوبیاں ان کے فارسی خطوط میں نہیں پائی جاتیں۔غالباً اسی سبب سے ڈاکٹر نذیر احمد[۱۹۱۵-۲۰۰۸ء] نے لکھا ہے کہ علامہ شبلی اگر بھرپور توجہ دیتے تو فارسی کے عمدہ نثر نگار ہوسکتے تھے۔لیکن ہمیں ڈاکٹر صاحب کے اس نقطہ نظر سے اس لئے اختلاف ہے کہ ان کی رائے عام فارسی نثر نگاری کے پس منظر میں ہے۔اگر وہ خاص ہندوستان کے پس منظر میں ان کا

تجزیہ کرتے تو یقیناً ان کا نقطۂ نظر اس کے برعکس ہوتا۔

عربی نثر نگاری میں علامہ شبلی جس طرح جاحظ [۷۷٦-۸٦۸ء] سے متاثر تھے، اسی طرح فارسی نثر نگاری میں وہ مرزا غالب سے متاثر تھے۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے ان کی نثر نگاری بالخصوص فارسی مکتوبات کی نثر پر روشنی ڈالی ہے اور لکھا ہے کہ

'' فارسی نثر میں وہ غالب سے متاثر ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے بعض الفاظ و فقرے مولانا نے لے لئے ہیں۔ جیسے ہمانا گختی، برآنبود، مایہ برخورداری، بادیہ پیمائی، ہرزہ ورائی، ستیزۂ چرخ، آویزش بخت، آبی برآتش زدن، چشم غم خواری، پاسخ، کشاکش غم، ہرزہ گردی، از ہردری سخن، رفتن ودنداں بدل فشردن، چہ مایہ انصاف بالائے طاعت است، آوخ، دروغ راست مانا، ہیچ است، اندیشہ بدامن خاطر او یخت، کالائے راستی۔''

(ماہنامہ معارف فروری ۱۹۸۰ء ص ۱۰٦)

ڈاکٹر صاحب نے یہ مثالیں فارسی خطوط شبلی سے نقل کی ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مرزا غالب کی پیروی میں علامہ شبلی ماضی تمنائی کا استعمال کثرت سے کرتے ہیں۔ اور انہوں نے اس کی متعدد مثالیں بھی اپنے طویل مضمون میں درج کی ہیں۔ (ماہنامہ معارف فروری ۱۹۸۰ء ص ۱۰٦)

ڈاکٹر نذیر احمد نے مکاتیب شبلی فارسی کی خصوصیات کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے، ان کا خیال ہے کہ علامہ شبلی کے خطوط کی زبان اکثر مسجع ہوتی ہے۔ مثلاً

۱۔ انجمنے از یاران ساز پذیرفتہ است و ہر یکے از ہر دری سخن پیوستہ

۲۔ تن بہ رضا داد دست از طلب باز داشتہ سر بفرمان نہادہ

۳۔ من گاہے خموشم دو قتے در دفع ایں مطاعن می کوشم۔

ان کا یہ بھی خیال ہے کہ خطوط شبلی کی زبان بامحادرہ اور رواں دواں ہوتی ہے۔ اسی طرح علامہ شبلی کے اسلوب نگارش کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ادیبانہ ہے۔ (ایضاً ص ۱۰۷) مگر انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ادیبانہ طرز اور بامحاورہ زبان کے باوجود کہیں کہیں اردو رنگ غالب

ہے۔ان کی چند مثالیں بھی انہوں نے نقل کی ہیں۔آخر میں وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ

''ان کے خطوط دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ نے نثر کی طرف کوئی خصوصی توجہ نہیں کی، ورنہ ان میں وہ جوہر فطری طور پر موجود تھا کہ فارسی نثر میں بھی ان کا وہی مرتبہ ہوتا جو شعر میں تھا۔(ایضاً ص۱۰۹)

علامہ شبلی کے یہ فارسی خطوط ان کی ابتدائی زندگی کے ہیں۔البتہ سرسید احمد خاں کے سفرنامہ پنجاب پر انہوں نے فارسی میں جو دیباچہ لکھا ہے وہ شاید ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر نہیں رہا۔اس کی فارسی نثر ان خطوط کی نثر سے زیادہ پختہ اور زیادہ فصیح ہے۔

یہاں ان کی عام نثر نگاری سے بحث نہیں ہے بلکہ خطوط نگاری کی خصوصیات سے بحث ہے۔ وہ فارسی خطوط بہت اہتمام سے لکھا کرتے تھے۔ایک خط کے سرے پر لکھا ہے ''بہ ترک الفاظ عربی''۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہیں فارسی خطوط سے کس درجہ دلچسپی تھی۔

ان خطوط کی اشاعت کا بھی انہیں ایک بار خیال پیدا ہوا تھا۔اور مولوی محمد سمیع کے نام ایک خط میں لکھا کہ میرے فارسی خطوط اور کلام جمع کر کے مولانا فاروق چریا کوٹی [۲۷/اکتوبر ۱۹۰۹ء] کے پاس بھیج دو، مگر پھر اردو کا نشہ ایسا چڑھا کہ یہ تمام باتیں دھری رہ گئیں۔

مولانا سید سلیمان ندوی کے سلسلہ شبلی شناسی کا ایک بڑا عظیم الشان کارنامہ علامہ شبلی کے مکاتیب کا حصول، ترتیب و تدوین اور دو جلدوں میں اشاعت بھی ہے۔فارسی خطوط کے بارہ میں انہوں نے مقدمہ میں لکھا ہے کہ

''مولانا کے خطوط کا جو ذخیرہ ہمارے پاس موجود ہے، اس کی قدیم سے قدیم تاریخ ۱۸۷۲ء تک پہنچتی ہے۔(فارسی مکتوب نمبر۱) اس زمانہ میں شرفا کی مراسلت کی زبان فارسی تھی۔چنانچہ ۱۸۸۲ء تک جب تک مولانا علی گڑھ نہیں گئے تھے ان کے تمام تر خطوط فارسی زبان میں ملتے ہیں۔وہاں جانے کے بعد بھی ان لوگوں کو جن کی نسبت معلوم تھا کہ ان کو فارسی سے ذوق ہے اسی زبان میں خط و کتابت کرتے تھے۔یہ فارسی خطوط مولانا عموماً قلم برداشتہ لکھتے تھے

لیکن ان میں بعض خط ایسے بھی ہیں جو انھوں نے کوشش اور محنت سے لکھے ہیں۔ایک خط کے سرے پر لکھا ہے کہ ''بہ ترک الفاظ عربی'' ان خطوط کی زبان رواں، بامحاورہ عبارت مقفی، لیکن بے تکلف ہے۔''

(مکاتیب شبلی، حصہ اول ص ۷)

مذکورادیبوں مولانا سید سلیمان ندوی اور ڈاکٹر نذیر احمد دونوں کی فارسی شعر وادب اور اس کی تاریخ پر بڑی گہری نگاہ تھی۔اس لئے ان کے خیالات نقل کئے گئے۔ان کے آراوخیالات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ علامہ شبلی نعمانی کے فارسی خطوط کی اہمیت کچھ کم نہیں۔البتہ ان کے فارسی کلام سے کم رتبہ ہیں۔

علامہ شبلی کے فارسی خطوط ان کے ابتدائی اور علی گڑھ کالج سے وابستگی سے پہلے کے حالات وسوانح کا بنیادی ماخذ بھی ہیں۔''حیات شبلی'' میں بھی ان کو بنیادی ماخذ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔اور کئی اہم سوانحی پہلوؤں کی ان سے وضاحت بھی ہوتی ہے۔اس لئے ان کی اپنی الگ نوعیت کی اہمیت ہے۔

ابتدائی خانگی زندگی میں ماں، باپ، بھائی سے تعلقات، والدہ کی وفات، اس دور کے بعض احباب اور دیگر متعلقین، علم وادب سے شغف اور گہری وابستگی وغیرہ موضوعات پر علامہ شبلی نعمانی کے فارسی خطوط کے بغیر ان کے سوانح نگار قلم آگے نہیں بڑھا سکتے۔ بلا شبہ علامہ شبلی کے فارسی خطوط متنوع اہمیت کے حامل ہیں۔

◆◆◆

[۲]

علامہ شبلی کا رسالہ ’’بیان خسرو‘‘

بیــان خســرو :علامہ شبلی کی مستقل تصنیف نہیں ہے بلکہ ان کی مشہور اور مقبول ترین تصنیف شعرالعجم کا ایک حصہ ہے۔ جس میں امیر خسرو [۱۲۵۳-۱۳۲۵ء] کے حالات وسوانح اور ان کی شاعری پر مفصل نقد وتبصرہ کیا گیا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی کے یادگار ادارہ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ نے ’’شعرالعجم‘‘ کا ۲۰۱۸ء میں جو ایڈیشن شائع کیا ہے ’’بیان خسرو‘‘ اس کی جلد دوم میں صفحہ ۸۸ سے صفحہ ۱۶۰ تک اس کے مباحث شامل ہیں۔

’’شعرالعجم‘‘ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ فارسی شعروادب کی ایسی عمدہ تاریخ آج تک لکھی نہیں گئی۔ بلکہ خود ایران میں جس کی ادبیات کا یہ گراں مایہ باب ہے وہاں بھی ایسی کتاب نہیں لکھی جاسکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی شعروادب کے دلدادگان نے اس کا والہانہ استقبال کیا، شائع کیا۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ کیا۔ ’’شعرالعجم‘‘ کے اب تک ۱۸/تراجم شائع ہوچکے ہیں۔ اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ اس کے لئے راقم حروف کی نئی کتاب ’’تصانیف شبلی کے تراجم‘‘ کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

’’شعرالعجم‘‘ کی مقبولیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے تمام ابواب بالخصوص شعرا کے تذکروں کو علاحدہ علاحدہ رسالوں اور کتابچوں کی شکل میں شائع کیا گیا۔ اور ایک دو ناشرین نے نہیں بلکہ دہلی، لکھنو، لاہور اور امرتسر کے متعدد ناشرین نے شائع کیا۔ اور نہ جانے کتنے ایڈیشن شائع کئے۔ اس کی تفصیل کتابیات شبلی میں درج کی جاچکی ہے۔ تاہم موقع کی مناسبت سے یہاں

بھی سلسلہ وار درج کیا جاتا ہے:

۱۔حیات حافظ : رنگین پریس دہلی،۱۹۲۳ء،۵۷ص

جامعہ ملیہ برقی پریس دہلی، غیر مورخہ،۵۶ص

قومی پریس دہلی،۱۹۲۳ء،۵۷ص

رحمانی پریس دہلی، غیر موخہ،۶۴ص

۲۔حیات سعدی : خواجہ برقی پریس دہلی، غیر مورخہ،۴۸ص

رحمانی پریس دہلی، غیر مورخہ،۵۵ص

مطبع مجتبائی دہلی، غیر مورخہ،۵۲ص

کانگریس پریس دہلی، طبع اول، غیر مورخہ،۵۲ص

کانگریس پریس دہلی، طبع دوم، غیر مورخہ،۵۲ص

کانگریس پریس دہلی، طبع سوم، غیر مورخہ،۵۲ص

رنگین پریس دہلی، غیر مورخہ،۵۲ص

نول کشور پریس دہلی، غیر مورخہ،۱۶ص

۳۔سوانح عمری نظامی گنجوی: مطبع مجتبائی دہلی، غیر مورخہ،۴۸ص

۴۔فردوسی : مطبع مجتبائی دہلی، غیر مورخہ،۶۳ص

۵۔فیضی : مطبع مجتبائی دہلی،۱۹۱۷ء،۲۲ص

یہ ایک اردو کتاب کی ایسی مقبولیت کا واقعہ ہے جس کی نظیر مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

''بیان خسرو'' کا قصہ بقول ملا واحدی یہ ہے کہ

> ''اردو زبان میں درویشی لٹریچر کو عروج دینا حلقہ المشائخ کا ایک اہم مقصد ہے۔اسی بنا پر رسالہ نظام المشائخ جاری کیا گیا۔اور یہی بات بار بار ہفتہ وار اخبار کا خیال پیدا کرتی رہتی ہے۔مگر ان سب سے بڑھ کر ضرورت ہے اس امر کی کہ تصوف اور اہل تصوف کے متعلق کتابیں لکھی جائیں جن کی اس زور وشور

سے اشاعت ہو کہ ملک کا کوئی کونہ ان سے خالی نہ رہے۔اسی ضرورت کومحسوس کر کے ہم نے گذشتہ ماہ میں حضرت شاہ فتح اللہی ،شمس العلما مولانا شبلی عالی جناب مولوی عزیز مرزا صاحب بی اے اور صاحب فتح الحمید مولوی فتح محمد خاں صاحب جالندھری۔ان چار برگزیدہ اور ممتاز مصنّفین کو لکھا کہ وہ کار زیر بحث میں ہماری مدد فرمائیں۔الحمدللہ ہر طرف سے اچھی صدا آئی۔چاروں بزرگوں نے ہماری درخواست کو قبول کیا۔

میں پہلا شکریہ علامہ شبلی کا ادا کرتا ہوں جنھوں نے صرف منظوری ہی نہیں فرمائی بلکہ جواب کے ساتھ کتاب بھی بھیج دی۔یہ جناب مخدوم کی ایسی تصنیف ہے کہ ہر گروہ اور ہر طبقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی ،یعنی سوانح عمری حضرت امیر خسروؒ۔ہمارے رسالہ کی تقطیع پر دوسو پونے دوسو صفحوں میں ختم ہوگی۔خیر مقدم کے لئے تیار رہئے۔‘‘(۱)

اس کے بعد ماہنامہ’’نظام المشائخ ‘‘دہلی کے صفحات میں’’بیان خسروؔ‘‘کے سلسلہ میں خامشی رہی۔البتہ علامہ شبلی کی دیگر تحریریں،نظمیں،غزلیں وغیرہ شائع ہوئیں۔دفتر نظام المشائخ نے ایک رسالہ’’اسلام کی بہاریں‘‘شائع کیا تو اس میں علامہ شبلی کی ایک نظم شامل کی گئی۔اس پر اخبار ’’توحید‘‘میرٹھ نے تبصرہ کیا تو اسے بھی نقل کیا گیا ہے۔تبصرہ یہ ہے:

’’اسلام کی برکتیں: یہ دلچسپ ومفید رسالہ درویش پریس ایجنسی دہلی نے ابھی حال میں شائع کیا ہے۔اس میں ظفر علی خاں صاحب ایڈیٹر زمیندار اور شمس العلما مولانا شبلی نعمانی اور خواجہ حسن نظامی دہلوی کے نہایت دلچسپ موثر خیالات ،دین وملت کی پرورش کرنے والے نظم ونثر کے مضامین درج ہیں۔ کتاب اس قابل ہے کہ مسلمان بچوں میں تقسیم کی جائے۔اور غالبًا اسی وجہ سے درویش ایجنسی نے اعلان کیا ہے کہ تقسیم کرنے والوں سے قیمت کم لی جائے گی۔‘‘(۲)

اس کے بعد ماہنامہ نظام المشائخ میں ''بیان خسروؔ'' کی اشاعت کا آغاز ہوا۔ پہلی قسط شعبان المعظم ۱۳۳۱ھ میں شائع ہوئی۔ مدیر نے لکھا ہے کہ

''۴۹ سے ۶۴ تک کے صفحات اس دفعہ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کی عطا کردہ کتاب 'بیان خسروؔ' کے لئے مخصوص کر دئے گئے ہیں۔ یہ محبوب المحبوب حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کی بے مثل سوانح عمری ہے۔ اس کے خاتمہ پر سیدی خواجہ حسن نظامی کا دلچسپ ومبسوط دیباچہ پیش کیا جائے گا۔ جس میں علاوہ مزید معلومات ان چند باتوں کے جواب بھی ہوں گے جو فاضل مصنف کے قلم سے ارادتاً یا غیر ارادتاً عقائد درویشی کے خلاف نکلے ہیں، لیکن ان چند باتوں کے سبب ہم آپ کی مساعی کو پس پشت نہیں ڈال سکتے۔ آپ نے ایسے گرامی قدر بزرگ کے حالات جمع ومرتب کر کے صوفیوں پر بڑا احسان کیا ہے۔'' (۳)

تین قسطوں میں ''بیان خسروؔ'' مکمل ہوئی۔ آخری قسط ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ میں شائع ہوئی۔ پھر ایک سال کی خاموشی کے بعد رجب ۱۳۳۲ھ میں نظام المشائخ میں اس کا اشتہار شائع ہوا۔ اہل ذوق کے لئے یہ اشتہار بھی دلچسپ ہے:

بیان خسرو: محبوب المحبوب حضرت امیر خسروؒ کی سوانح عمری اور ان کے کلام پر محققانہ ریویو، از شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی جیسے کا ذکر ہے ویسا ہی ذکر کرنے والا بھی ہے، حضرت امیر کو کون نہیں جانتا، دنیاوی اعتبار سے بادشاہ کے مصاحب علم وفضل کے لحاظ سے یکتائے زمانہ، شاعری میں آج تک طوطی ہند کہلائے جاتے ہیں۔ بزرگ اور اللہ والے تو تھے ہی جس پر سلطان نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کی نظر لطف ومحبت ہو وہ کیا کچھ نہ ہوگا۔ پھر ان کے حالات آج کل کے سب سے بڑے تاریخ داں، زبردست انشاء پرداز، شہرۂ آفاق فاضل نے قلم بند فرمائے ہیں۔'' (۴)

ماہنامہ نظام المشائخ دہلی میں یہ مفصل اور ایک مختصر اشتہار وقفہ وقفہ سے شائع ہوتا رہا۔ ربیع الثانی ۱۳۳۳ھ میں اشتہار کے بعد پھر اس کا کوئی اشتہار نظر سے نہیں گذرا۔ غالباً دفتر نظام المشائخ کا یہ آخری اشتہار تھا۔

ماہنامہ ''نظام المشائخ''، دہلی میں وقفہ وقفہ سے اشتہار اور مسلسل ذکر سے رسالہ ''بیان خسرؔ'' نے علامہ شبلی کے اور کتابچوں اور رسالوں کے مقابلہ میں کچھ زیادہ شہرت ومقبولیت پائی۔ اس کا ایک سبب خود امیر خسرو کی شخصیت، شاعری اور ان کا فکر وفن ہے۔ ان کا شمار ہندوستان کے عظیم صوفیا اور بزرگ شخصیات میں ہوتا ہے۔ بہر حال صوفی امیر خسرو کی شخصیت اور علامہ شبلی کا انشا پردازانہ قلم دونوں ایک ہوکر ''بیان خسرؔ'' کی صورت میں سامنے آئے۔ یہی وجہ ہے کہ ''بیان خسرؔ'' نے بے حد مقبولیت پائی۔

''بیان خسرؔ'' کا پہلا ایڈیشن دفتر ماہنامہ نظام المشائخ دہلی سے شائع ہوا۔ ناشر نے یہ اہتمام کیا کہ اسے اس عہد کے اخبارات ورسائل کے پاس تبصرے کے لئے بھیجا۔ چنانچہ متعدد اخبارات اور علمی وادبی رسائل نے اس پر تبصرہ شائع کیا۔ اس طرح کے کئی تبصرے انہوں نے اپنے رسالہ ''نظام المشائخ''، دہلی میں نقل کئے ہیں۔ یہاں بطور یادگار ان تبصروں کو نقل کیا جاتا ہے۔

اخبار نیر اعظم مراد آباد کا ریویو

''بیان خسرو یعنی حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری اور ان کے کلام پر محققانہ ریویو۔ از شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی

عجیب دلچسپ کتاب ہے۔ شبلی صاحب کی تصانیف اور ان کا بیان کبھی بے نمک نہیں ہوتا۔ امیر خسرو کے تفصیلی حالات پر ہم بحث کرنا اس وجہ سے نہیں چاہتے کہ پبلک اس نام سے کئی حیثیتوں سے واقف ہے۔ شبلی صاحب نے امیر خسرو کے کلام پر بڑی خوبی سے ریویو کیا ہے اور ان کے حالات اور قصص لکھے ہیں۔ اس کے ساتھ جابجا کتاب میں فٹ نوٹ بھی دئے گئے ہیں۔ کسی شخص

کی سوانح عمری میں جوضروری باتیں ہونی چاہئے، وہ سب اس میں موجود ہیں۔ ۱۸+ ۲۲ کی خوش نما تقطیع پر ۸۶صفحہ پرنہایت خوشنمائی سے ولایتی سفید کاغذ پر محمد الواحدی اڈیٹر نظام المشائخ دہلی نے شائع کیا ہے۔ قیمت علاوہ محصول ڈاک کے صرف ۱۰/آنے ہے۔ اہل مذاق دوست حضرات اس کی قدردانی فرمائیں۔''(۵)

صحیفہ۔بجنور کا ریویو

رسالہ ''صحیفہ'' بجنور نے یہ چند سطریں لکھیں:

''بیان خسرو'': مولوی محمد الواحدی صاحب دہلوی اڈیٹر نظام المشائخ دہلی نے علامہ شبلی نعمانی کی ایک تازہ تصنیف بیان خسرو شائع کی ہے، جس میں امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری اوران کے کلام پر محققانہ ریویو کیا ہے۔ ضخامت ۸۲/صفحے، کاغذ ولایتی، اور چھپائی بھی ولایتی طریقہ کی۔ ٹائٹل رنگین، قیمت علاوہ محصول ڈاک کے ۱۰/آنے۔ جو بمقابلہ اس کی خوبیوں کے زیادہ نہیں ہے۔ دفتر نظام المشائخ دہلی سے مل سکتی ہے۔(۶)

آزاد اخبار کان پور کا ریویو

ماہنامہ زمانہ کان پور کے مدیر منشی دیانرائن نگم [۱۸۸۲-۱۹۸۲ء] کا ہفتہ وار اخبار آزاد کانپور ان دنوں بہت پڑھا جاتا تھا۔ یہ نہ صرف اخبار کی حیثیت سے بہت مقبول تھا بلکہ ادیبوں اور شاعروں کا بھی مرکز توجہ تھا۔ اس میں علامہ شبلی کی بھی بعض تحریریں شائع ہوئیں اوران کی تصنیفات وتالیفات پر متعدد مضامین ومقالات شائع ہوئے۔ ''سفرنامہ روم ومصروشام'' پر صاحب ''البرامکہ'' مولوی عبدالرزاق کان پوری کا تبصرہ اوران سے بھی پہلے مولوی محبوب الرحمٰن کلیم جیراج پوری کا ''الفاروق'' پر تبصرہ اسی آزاد اخبار کان پور میں شائع ہوئے تھے مگر آج ادبی دنیا ان دونوں تحریروں

سے محروم ہے۔ البتہ ''بیان خسروؔ'' پر جو چند سطریں اس میں شائع ہوئی تھیں اور جنہیں ملا واحدی نے ماہنامہ ''نظام المشائخ'' دہلی میں شائع کر کے محفوظ کر دیا تھا، آج دستیاب ہیں۔ البتہ انہوں نے یہ صراحت نہیں کی ہے کہ یہ تبصرہ وتعارف کس کے قلم سے ہے اور مذکورہ رسائل کے کس شمارہ میں شائع ہوا ہے۔

بیان خسرو

''امیر خسرو ہندوستان کے ایک مشہور شاعر ہیں۔ جن کے حالات زندگی اور ان کے کلام پر ریویو کے طور پر شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی نے ایک بسیط مضمون لکھا تھا اور جسے ملا محمد الواحدی صاحب ایڈیٹر رسالہ نظام المشائخ دہلی نے کتاب کی صورت میں شائع فرمایا ہے۔ مولانا صاحب کی مسلسل علمی خدمات اردو کے لئے قابل شکر گذاری ہیں۔

ضخامت ۸۱ صفحات قیمت ۱۰/ آنے غیر مجلد، ملا صاحب موصوف سے دستیاب ہوسکتی ہے۔'' (۷)

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا ریویو

علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ تو علامہ شبلی نعمانی کی تحریروں سے بھرا پڑا ہے۔ دیکھئے کب کوئی اسکالر اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ ''بیان خسروؔ'' کا اس میں جو تعارف شائع ہوا ہے اسے بھی ملا واحدی نے ماہنامہ ''نظام المشائخ'' دہلی میں نقل کیا ہے۔ جو یہ ہے:

''بیان خسرو: حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ جیسے باکمال وجامع حیثیات بزرگ گذرے ہیں اس کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ آپ کی مختصر سوانح عمری جس میں آپ کے کلام پر نہایت دلچسپ اور محققانہ ریویو کیا گیا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی کی لکھی ہوئی دفتر 'نظام المشائخ' دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ گو کتاب مختصر

ہے،لیکن علامہ شبلی کے قلم نے صاحب تذکرہ کے خط وخال کافی طور پر نمایاں کردئے ہیں۔خسرو کی زندگی اخلاقی اعتبار سے بھی ایک اعلیٰ نمونہ ہے،جس کی نظیر بہت کم ملتی ہے۔ان کی زندگی کا بڑا حصہ گو امرا وسلاطین کے دربار میں گذرا تاہم انسانی آزادی کے جوہر کوانہوں نے کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔چنانچہ ایک موقع پر اپنی درباری زندگی کی مجبوری کونہایت صفائی کےساتھ ظاہرکردیاہے کہ

باسم زیرائے نفس خودرائے پیش چو خودے ستادہ برپائے

سلطان علاء الدین خلجی جیسے سنگ دل اورذی دبدبہ شخص کو جوخودی (یعنی مثل اپنے ہی ایک معمولی انسان) قراردے دیناا گرغور کیا جائےتو کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔بلاشبہ کتاب مطالعہ کئے جانے کے قابل ہے۔ قیمت دس آنے ، ملنے کا پتہ دفتر نظام المشائخ دہلی (۸)

دفتر نظام المشائخ دہلی عرصہ تک بیان خسر وفروخت کرتا رہا۔اوراس کا اشتہار وقفہ وقفہ سے ماہنامہ ''نظام المشائخ''، میں چھپتا رہا۔اس دوران علامہ شبلی نے وفات پائی۔انا لله و انااليه راجعون. وفات کے بعد بھی ''بیان خسروؔ'' کی تشہیرواشاعت کا سلسلہ قائم رہا۔

اس کے بعد مولوی ظفر الملک علوی مالک الناظر بک ڈپو لکھنواور مدیر ماہنامہ الناظر لکھنو نے ''بیان خسروؔ'' کواپنے ادارے سے شائع کیا۔اور غالباًایک سے زاید ایڈیشن شائع کئے چونکہ اس کے سرورق پر علامہ شبلی نعمانی کے نام میں مرحوم کی صراحت ہے،اس لئے ظاہر ہے بلکہ قطعی ہے کہ الناظر بک ڈپو لکھنو کا مطبوعہ ایڈیشن ملا واحدی مرحوم کے یعنی دہلی ایڈیشن کے بعد شائع ہوا۔اس کا ایک ایڈیشن رحمانی پریس دہلی نے بھی شائع کیا ہے،جس پر سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔

''بیان خسروؔ'' کی یہ مقبولیت ہی کہی جائے گی کہ دائرہ ادبیہ لکھنو نے ۱۹۲۳ء میں اس کا ایک ایڈیشن ''حیات خسروؔ'' کے نام سے شائع کیا۔اور بہت اہتمام سے عمدہ کاغذ وطباعت کے ساتھ شائع کیا۔ یہ بھی اہتمام کیا کہ ابتک اس میں فہرست نہیں تھی اس کا اضافہ کیا اورعلامہ شبلی

نعمانی کی درج ذیل تحریر کو ابتدا میں دیباچہ کی جگہ شامل کیا:

''حضرت امیر خسرو کا حال تمام تذکروں میں کسی قدر تفصیل سے پایا جاتا ہے۔ تاریخ فرشتہ میں بھی دلچسپ واقعات ہیں، لیکن خود امیر صاحب نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں جو مختصر حالات لکھے ہیں وہ سب زیادہ قابل اعتبار ہیں۔ جہاں تک اس میں مذکور ہیں میں نے اسی کو اپنا ماخذ قرار دیا ہے۔ امیر صاحب کی دیگر تصانیف سے بھی ان کے واقعات معلوم ہوتے ہیں، چنانچہ موقع بموقع ان کے حوالے دئے جائیں گے۔ ڈاکٹر ریو نے برٹش میوزیم لندن کی قلمی کتابوں کی جو فہرست مرتب کی ہے اس میں حضرت امیر خسرو کی تصنیفات سے ان کے حالات مرتب کئے ہیں۔ کہیں کہیں اس سے بھی مدد لی گئی ہے۔''ش''(۹)

''حیات خسرو'' میں ذیلی سرخیاں بھی اہتمام سے درج کی گئی ہیں۔ لکھنو ایڈیشن میں بھی ذیلی سرخیاں ہیں، مگر وہ متن کے درمیان ہیں۔ اس کا ایک ایڈیشن مطبع مجتبائی دہلی نے بھی شائع کیا ہے۔ البتہ اس پر سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔ ۱۹۳۳ء میں ''حیات خسرو'' کو ادبی پریس لکھنو نے بھی شائع کیا تھا۔ اس کے صفحات کی تعداد ۱۰۶/ ہے۔ گویا یہ دائرہ ادبیہ لکھنو کا عکس ہے۔

تصانیف شبلی کے دو دہلوی ناشرین سید ظہور الحسن موسوی اور منشی سید محمد قربان علی بسمل دہلوی نے بھی ''بیان خسرو'' کے متعدد ایڈیشن شائع کئے۔ ان کے علاوہ ''بیان خسرو'' کی کسی اور اشاعت کی تفصیل معلوم نہیں ہوسکی۔

''بیان خسرو'' علامہ شبلی نعمانی کی مستقل تصنیف نہ ہونے باوجود اہل ذوق کو اس سے مستقل تصنیف کے برابر فیض پہنچا اور ایک عرصہ تک صوفی امیر خسرو کے حالات وسوانح اور شاعری سے واقفیت کا یہی ایک ذریعہ رہا۔ اور اب بھی اس کی افادیت کم نہیں ہوئی ہے، اس لئے اگر قدر دانان علامہ شبلی سے اس کی ایک اور خوب صورت اشاعت کی تمنا کی جائے تو غالباً بیجا خواہش نہ ہوگی۔

تعلیقات وحواشی:

(۱) ماہنامہ نظام المشائخ دہلی جلد ۵ قسم دوم، رمضان ۱۳۲۹ھ، ص ۶۶-۶۷

(۲) ماہنامہ نظام المشائخ دہلی، محرم ۱۳۳۲ھ، ص ۴۵

(۳) ماہنامہ نظام المشائخ دہلی، شعبان ۱۳۳۱ھ، ص ۱

(۴) ماہنامہ نظام المشائخ، دہلی۔ رجب ۱۳۳۲ھ ص ۶۶

(۵) ماہنامہ نظام المشائخ، دہلی، جلد ۱۰، نمبر ۴، بابت ربیع الثانی ۱۳۳۲ھ ص ۲۲

(۶) ماہنامہ نظام المشائخ، دہلی، جلد ۱۰، نمبر ۴، بابت ربیع الثانی ۱۳۳۲ھ ص ۳۸

(۷) ماہنامہ نظام المشائخ، دہلی، جلد ۱۰، نمبر ۱، بابت ماہ جمادی الاول ۱۳۳۲ھ ص ۱۸

(۸) ماہنامہ نظام المشائخ، دہلی، جولائی ۱۹۱۳ء، ص ۱۸

(۹) حیات خسرو ص ۳

◆◆◆

[۳]

الندوہ

مولانا ظفرعلی خاں کی ایک نادر تحریر

بابائے صحافت مولانا ظفرعلی خاں [۱۸۷۳-۱۹۵۶ء] علامہ شبلی کے زمانہ علی گڑھ کے شاگرد تھے۔ چنانچہ بڑا تعلق خاطر رہا۔ کئی باتوں میں علامہ شبلی سے اختلاف کے باوجود مولانا ظفر علی خاں ان کا بڑا ادب واحترام کرتے تھے۔ علامہ شبلی بھی حسب مزاج اور حسب معمول ان کے ساتھ شفقت فرماتے تھے۔

مولانا ظفرعلی خاں نے متعدد رسائل دکن ریویو، پنجاب ریویو، ستارہ صبح جاری کئے اور آخر میں اپنے والد مولوی سراج الدین کے اخبار زمیندار لاہور سے وابستہ ہوئے، جسے انہوں نے ۱۹۰۳ میں جاری کیا تھا۔ مولانا ظفرعلی خاں جہاں بھی رہے اور جس رسالہ کی ادارت سے وابستہ رہے علامہ شبلی نے ان کا علمی تعاون کیا۔ دکن ریویو اور پنجاب ریویو اور زمیندار میں ان کے مضامین، مراسلات اور متعدد غزلیں اس کی زینت بنیں۔

دکن ریویو میں تو ''شعرالعجم'' کا ایک باب شعرالعجم کی اشاعت سے پہلے ہی انہیں شائع کرنے کے لئے دیدیا تھا۔ جسے انہوں نے کئی قسطوں میں شائع کیا ہے۔ اس کی اشاعت کا سلسلہ شروع کرتے ہوئے انہوں نے ایک نوٹ لکھا ہے کہ

''شعرالعجم علامہ شبلی نعمانی کی وہ معرکۃ الآرا تصنیف ہے جسے ایرانی لٹریچر کا

دائرۃ المعارف کہنا چاہئے۔اس بے مثل کتاب کی پہلی جلد جس کی ضخامت چار
سو صفحے ہوگی اور جو نظامی گنجوی کے حالات پر ختم ہوتی ہے زیر طبع ہے۔علامہ
ممدوح نے ان عنایات وتوجہات کے اقتضا سے جو آپ ہمارے حال پر ہمیشہ
مبذول فرماتے ہیں شعر العجم کا ایک ٹکڑا دکن ریویو کے لئے مرحمت فرمایا ہے۔
جس کا ایک حصہ ہدیہ ناظرین ہے۔اس اقتباس سے ہمارے ناظرین شعر العجم
کے محاسن کا قبل اس کے کہ کتاب چھپ کر ان کے ہاتھوں میں پہنچ سکے اندازہ
کرسکیں گے۔دوسرا حصہ آیندہ کے پرچہ کا زیب عنواں ہوگا۔''

''جہاں گیر اور تزک جہاں گیری'' علامہ شبلی کا بڑا معرکۃ الآرا تاریخی مقالہ ہے۔اس کی اشاعت کا آغاز بھی ''دکن ریویو'' سے ہوا۔پھر متعدد رسائل نے اسے نقل کیا۔

دکن ریویو میں کئی ایسی تحریریں بھی شائع ہوئی ہیں جن میں علامہ شبلی کی تحریروں پر نقد بھی کیا گیا ہے۔ایک بار تو خود فاضل شاگرد نے بھی نقد کیا تھا اور قدرے بیباکانہ انداز میں تنقید کی تھی جس پر مولانا الطاف حسین حالی [۱۸۳۷-۱۹۱۴ء] نے انہیں بڑے پیار سے سمجھایا تھا، مگر علامہ شبلی نے انہیں کچھ نہیں کہا۔

مولانا ظفر علی خاں کے سیاسی خیالات بڑی حد تک علامہ شبلی سے ہم آہنگ تھے۔غالباً یہی وجہ تھی کہ آزادی اور تقسیم کے بعد انہیں وہ جائز مقام نہیں مل سکا، جس کے اصلاً وہ مستحق تھے۔

ماہنامہ ''الندوہ'' کے اجرا کے متعدد مقاصد تھے، اس کی تعارفی تفصیل راقم الحروف کی تصنیف ''آثار شبلی'' میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔اس کے بڑے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔سب سے بڑی بات یہ کہ علامہ شبلی نعمانی کے بعد ہندوستان میں اہل قلم کی جونسل تیار ہوئی، اس کے چند نمایندہ اہل قلم اسی الندوہ کے فیض یافتہ تھے۔ان میں ایک اہم نام مولانا عبدالسلام ندوی [۱۸۸۳-۱۹۵۶ء] کا بھی ہے۔جن کا مولانا ظفر علی خاں نے بھی اپنے تبصرے میں ذکر کیا ہے۔

مولانا ظفر علی خاں ایک بڑے شاعر تھے۔متعدد مجموعہ کلام بہارستان، نگارستان اور ''چمنستان'' ان کی خوب صورت شاعری کے نمونے ہیں، لیکن وہ نثر بھی بہت عمدہ اور خوب صورت

لکھتے تھے۔

کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ایک بار وہ سرائے میر آئے بھی آئے تھے اور سرائے میر پر ایک نظم بھی کہی ہے۔ بہر حال ان کی زیر نظر نادر تحریر جس میں انہوں نے ماہنامہ الندوہ کا تعارف اپنے استاذ کے ذکر خیر کے ساتھ پیش کیا ہے، اس قابل ہے کہ اسے دوبارہ شائع کیا جائے۔ ''نگارشات مولانا ظفر علی خاں'' کے نام سے ان کی تحریروں کی جمع و تدوین اور اشاعت کا جو سلسلہ لاہور میں شروع ہوا ہے۔ اس کی پہلی جلد نظر سے گذری ہے۔ اس میں یہ تحریر شامل نہیں ہے۔

الندوہ

علم و حکمت کسی خاص قوم کی میراث اور کسی خاص طبقہ سے مخصوص نہیں ہے۔ یہ ایک مشترکہ ترکہ ہے جو بنی نوع انسان کو اپنے مورث اولیں سے ملا ہے۔ اس کی شعاعیں ہر ملک اور ہر قوم پر یکساں اپنا پرتو ڈالتی ہیں اور اس لحاظ سے وہ پرچے جو معلومات انسانی میں بلا تفریق مذہب وملت اضافہ کرتے ہوں ہماری توجہ کے خاص طور سے محتاج ہیں۔ ایسے پرچوں کی صف اول میں ہم الندوہ لکھنو (۱) کو جگہ دیتے ہیں۔ جس کی سب سے بڑی تعریف یہ ہے کہ اس کے ایڈیٹر استاذ نا وملاؤنا افتخار ملک وقوم علامہ شبلی نعمانی ہیں۔ ہندوستان میں اردو لکھنے اور پڑھنے والے اب کثرت سے پیدا ہوگئے ہیں اور علامہ ممدوح کی تاریخی وادبی تصانیف نے اردو داں پبلک کا مذاق بہت کچھ نکھار دیا ہے۔ اس بنا پر ہمیں امید تھی کہ الندوہ جیسا پرچہ جو اپنے قسم کا ایک ہی پرچہ ہے نہایت ہی کثیر الاشاعت ہوگا، لیکن منیجر صاحب رسالہ سے ہمیں یہ سن کر نہایت ہی تعجب اور افسوس ہوا کہ اس کی تعداد خریداران جیسی چاہئے ویسی نہیں ہے۔ ہم اسے اردو داں طبقہ کی نہایت بدنصیبی سمجھتے ہیں کہ سال بھر میں دو روپیہ اس بہترین دماغی اور علمی نعمت کے لئے صرف نہیں کر سکتے۔

عالم گیر کے متعلق دسمبر کے نمبر میں علامہ شبلی کا مضمون اس قابل ہے کہ مغربی دنیا کے بہتر سے بہتر علمی رسالہ میں جگہ پائے۔ (۲) ہماری رائے میں اورنگ زیب کا سب سے بڑا قصور اس کی بدنصیبی ہے جس کی علامہ شبلی نے یوں کھینچی ہے:

''عبدالقادر بدایونی نے نکتہ چینی کے ساتھ اکبر کے صحیح صحیح واقعات قلم بند کیئے۔ جہانگیر نے اپنے زمانہ حکومت میں حکم دیا کہ اس کی اشاعت قطعاً بند کردی جائے۔نعمت خاں عالی نے وقایع نعمت خاں میں سرتاپا عالم گیر کی ہجو لکھی ،لیکن عالم کے جانشین بہادرشاہ نے شیعیت کی مناسبت سے نعمت خاں عالی کو دانش مند خاں کا خطاب دیا اور وقایع نعمت خاں درس میں داخل ہوگئی۔ عالم گیر کو جب بہادرشاہ ساجانشین اور نعمت خاں عالی،خافی خاں،شاہ نواز خاں جیسے واقعہ نگار ہاتھ آئیں تو بے چارے کو نیک نامی کی کیا توقع ہوسکتی ہے۔''

اورنگزیب کی بدنصیبی کا تعلق جس حد تک اس کے جانشینوں سے ہے،اس کی تلافی تو زمانہ نہیں کرسکتا،لیکن جس حد تک اس کے وقایع نگاروں سے ہے،اس کی تلافی کا موقع ابھی ہاتھ سے نہیں گیا اور ہم اورنگ زیب کو باوجود ابتک ہدف مطاعن وملاعن رہنے کی نہایت درجہ خوش قسمت سمجھیں گے اگر اسے شبلی جیسا مورخ ہاتھ آجائے۔ہمیں یقین ہے کہ مولانا کے''رایل ہیروز آف اسلام'' میں اس سب سے زیادہ مظلوم اور ہندوستان کے سب سے زیادہ جلیل القدر فرماں روا کا نام ضرور ہوگا،لیکن اگر نہ ہوتو ہم چاہتے ہیں کہ آیندہ کتاب جو اس سلسلہ میں نکلے وہ''اورنگ زیب عالم گیر'' ہو۔کیونکہ ضرورت ہے کہ اورنگزیب کے متعلق جو غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں اور جو عوام سے گزر کر خواص تک پہنچ گئی ہیں اور جس کے پھیلانے والوں کی سب سے بڑی بین اور واضح مثال آنریبل مسٹر گوکھلے [۱۸۶۶-۱۹۱۵ء] ہیں دور کی جائیں۔ (۳)

قوم کو علامہ شبلی کا نہایت شکرگذار ہونا چاہئے کہ انہوں نے اپنی علمی وتاریخی گہرریزی کو اپنے قلم ہی تک محدود نہیں رکھا بلکہ وہ دارالعلوم ندوہ کے ذریعہ سے ایسے طلبا پیدا کررہے ہیں جو اس مذاق کو پھیلانے اور قایم رکھنے میں بہت عرصہ تک حصہ لیں گے۔نمونہ کے طور پر ہم محمد عبدالسلام صاحب متعلم دارالعلوم ندوہ کو پیش کرسکتے ہیں(۴)،جن کا مضمون''امام مسلم'' قدر سے دیکھے جانے کے قابل ہے۔(۵)

تعلیقات وحواشی:

(۱) الندوہ جولائی ۱۹۰۴ء میں دارالعلوم ندوہ سے علامہ شبلی اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی مشترکہ ادارت میں جاری ہوا۔ مئی ۱۹۱۲ء تک علامہ شبلی نے ادارت کے فرائض انجام دئے اور پھر مخالفین ندوہ کی ریشہ دوانیوں سے مجبور ہو کر مستعفی ہو گئے۔ ان کی ادارت میں شائع ہونے والے الندوہ کو شبلی صدی کے موقع پر ۹ جلدوں میں دارالمصنّفین نے شائع کر دیا ہے۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار صاحب نے اس کا اشاریہ مرتب کیا ہے جو ماہنامہ ادیب کے شبلی نمبر میں چھپا ہے۔ ایک اور اشاریہ ماہنامہ معارف میں بھی شائع ہوا ہے۔

(۲) الندوہ کا یہی سلسلہ مضامین ہے جس میں علامہ شبلی نے عالم گیر پر عائد بے سروپا الزامات کی نہایت مدلل انداز میں تردید کی ہے۔ یہی بعد میں ''مضامین عالم گیر'' اور ''اورنگزیب عالم گیر پر ایک نظر'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ نے ۱۹۹۹ء میں راقم کی ترتیب و تدوین کے بعد شائع کیا۔ اس وقت یہ کتاب مکتبہ دارالمصنّفین پر دستیاب ہے۔

(۳) مسٹر گوپال کرشن گوکھلے [۱۸۶۶-۱۹۱۵ء] کانگریسی لیڈر، ہندوستان کے ایک اعتدال پسند رہنما اور مشہور مجاہد آزادی تھے۔ انہوں نے الفنسٹن کالج بمبئی سے تعلیم حاصل کی۔ بی اے کرنے کے بعد فرگوسن کالج پونہ میں عرصہ تک تدریسی خدمات انجام دیں۔ پھر خود کو قومی کاموں کے لئے وقف کر دیا اور تاحیات وطن کی خدمت کرتے رہے۔ سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی کی بنا انہیں نے رکھی تھی۔ انگریز مخالف ہوتے ہوئے اصلاحات کے علمبردار تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں حلقوں میں مقبول تھے، لیکن جب انگریز مخالفت زوروں پر تھی انہوں نے راہ اعتدال کا راستہ نہیں چھوڑا اور دقتوں کا سامنا کیا۔ ۲۶ر نومبر ۱۹۱۵ء میں بمبئی انتقال کیا۔ یہ مہاراشٹر کے رتنا گیری کے رہنے والے تھے۔ علامہ شبلی نے ان کے سیاسی تدبر کی بنا پر مبالغہ آمیز تحسین کی ہے، مگر ان کے شاگرد عالم گیر پر تنقید کے سبب ان کے ہم نوا نہیں۔

(۴) علامہ شبلی کے تلمیذ خاص مولانا عبدالسلام ندوی جوان کے ہم وطن یعنی اعظم گڑھ کے رہنے

والے تھے، ندوہ میں تعلیم پائی تھی۔ان کا پہلا مضمون ماہنامہ الندوہ میں تاریخ پر ۱۹۰۶ء میں شائع ہوا۔ علامہ شبلی نعمانی نے انہیں انعام سے نوازا۔اس طرح مولانا ظفر علی خاں کا خیال درست ثابت ہوا۔ مولانا عبدالسلام ندوی اور دوسرے تلامذہ شبلی نے اہل قلم اور مصنف کی حیثیت سے ملک میں بڑا اہم مقام حاصل کیا۔اوران کی تصانیف سے ملک وملت کو بڑا فائدہ پہنچا۔

(۵) ماہنامہ دکن ریویو حیدرآباد، سلسلہ جدید، فروری ۱۹۰۷ء، ص ۹۰-۹۲

◆◆◆

[۴]

سائل دہلوی کی تضمین

علامہ شبلی کے شہر آشوب اسلام نے بڑی مقبولیت پائی تھی اور آج بھی وہ دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا کر دیتی ہے۔ ایک زمانہ میں اتحاد اسلامی کے جلسوں میں اسے خاص طور پڑھوایا جاتا تھا اور اب بھی بعض بعض جلسوں میں پڑھی جاتی ہے۔

شہر آشوب اسلام کی حال ہی میں ایک تضمین دستیاب ہوئی ہے۔ یہ دبستان دہلی کے ایک مشہور شاعر ابوالمعظم سراج الدین خاں سائل دہلوی [۱۸۶۴-۱۹۴۵ء] کی کاوش ہے۔ انہوں نے علامہ شبلی کے مسدس کے جواب میں مخمس لکھا ہے اور یہ مخمس سادگی، سنجیدگی اور متانت و وقار کے لحاظ سے تو ایک قابل ذکر تضمینی تخلیق ہے ہی، شاعرانہ اصول ونظریات کے لحاظ سے بھی ایک قابل ذکر تخلیق ہے۔ وہی دہلوی آداب، رکھ رکھاؤ، فکر وفن کی بلندی اور وضع داری کے پہلو اس میں دکھائی دیتے ہیں، جس کے لئے دبستان دہلی معروف ہے۔ اور جسے اب ہم تخلیقات اور کتبات وغیرہ ہی میں دیکھ سکتے ہیں۔

علامہ شبلی کا شہر آشوب اسلام ایک طویل نظم ہے۔ سائل دہلوی کی یہ تضمین بھی اسی طرح خاصی طویل ہے۔ اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

علامہ شبلی اور سائل دہلوی ایک دوسرے سے واقف اور آگاہ تھے۔ خواجہ حسن نظامی [۱۸۷۶-۱۹۵۵ء] کے نام علامہ شبلی کے ایک خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں میں گہرے اور بے تکلفانہ مراسم تھے۔ علامہ شبلی نے ندوہ کے سالانہ جلسہ میں خواجہ حسن نظامی اور بعض دوسرے احباب کو

شرکت کی دعوت دی۔ غالباً سائل دہلوی کا ذکر کرنا بھول گئے تو خواجہ صاحب نے انہیں یاد دلایا۔ اس کے جواب میں علامہ شبلی نے لکھا کہ

''سائل صاحب آپ کے نہیں بلکہ میرے ہیں۔ میں نے دانستہ ان کو تکلیف نہیں دی۔ بہرحال ان کو آج لکھتا ہوں۔''(۵)

سراج الدین سائل دہلوی خانوادہ مرزا غالب [۱۷۹۷-۱۸۶۹ء] کے ایک فرد نواب ضیاء الدین خاں نیر کے پوتے اور نواب شمس الدین خاں کے صاحبزادے تھے۔ان کا شمار حلقہ داغ کے ممتاز شعرا میں ہوتا ہے۔ علامہ شبلی جس زمانہ میں حیدرآباد کے سررشتہ علوم فنون کے ناظم کے عہدہ پر فائز تھے۔نواب مرزا داغ [۱۸۳۱-۱۹۰۵ء] بھی اس وقت دولت آصفیہ سے وابستہ تھے اور سائل دہلوی مشق سخن کے لئے ان کی صحبت میں وہیں مقیم تھے۔ داغ کی محفلوں میں علامہ شبلی بھی کبھی کبھی شریک ہوتے تھے۔ غالباً دونوں میں وہیں یعنی حیدرآباد میں ربط ضبط قائم ہوا۔

سائل دہلوی کی تضمین عہد شبلی کی یادگار ہے۔اور علی گڑھ سے شائع ہونے والے رسالہ ماہنامہ ''اولڈ بوائے'' فروری ۱۹۱۳ء کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔ یقیناً علامہ شبلی کی نظر سے بھی گذری ہوگی، مگر ان کی تحریروں میں اس کا کہیں ذکر نہیں ملا۔

سائل دہلوی کی یہ تضمین بڑی سنجیدہ اور متین تضمین ہے اور اس میں وہی سماں پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جس ماحول اور پس منظر میں علامہ شبلی نے اپنی نظم کہی ہے۔مگر فکر و فن پر قابو ہونے کے بعد بھی سائل دہلوی وہ دل دردمند اور وہ جذبہ کہاں سے لاتے جو شبلی کا خاصہ تھا اور جو شبلی ہی کے ساتھ چلا گیا۔

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام ونشاں کب تک

دعائے عافیت مانگے گا دین خستہ جاں کب تک مخالف گردشیں کرتا رہے گا آسماں کب تک
ستائے گا بتا اے کوکب نامہرباں کب تک حکومت پر زوال آیا تو پھر نام ونشاں کب تک
چراغ کشتہ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک

بڑھے گر چار سو سے سوئے دامن آہنیں پنجے   پکڑ کر گوشہ دامن ستم گاروں نے گر کھینچے
رہے گی تاج وتخت روم کی پھر آبرو کیسے   قبائے سلطنت کے گر فلک نے کردئے پرزے
فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک

سنے کوئی تو ہم اس سے کہیں بھی مدعا یہ ہے   مصیبت اپنے اوپر یہ پڑی ہے ماجرا یہ ہے
یہ دل میں درد پیدا ہو گیا ہے عارضہ یہ ہے   مراکش جاچکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ترکی کا مریض سخت جاں کب تک

جنود مانٹی میداں سے جو بڑھتا آتا ہے   قشون سرویہ اس شان سے جو بڑھتا آتا ہے
سحاب عیش اب یونان سے جو بڑھتا آتا ہے   یہ سیلان بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے
اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک

خبر ہے اپنے بیگانے ہیں کیا کیا دیکھنے والے   مراد غیر یا اپنی تمنا دیکھنے والے
کئے بیٹھے ہیں بند آنکھوں کو مانا دیکھنے والے   یہ سب ہیں رقص بسمل کا تماشا دیکھنے والے
یہ سیر ان کو دکھائے گا شہیدان خستہ جاں کب تک

یہ صورت درد ہے مرغوب کن کو کن کو بھاتی ہے   صدا ماتم کی دل خوش کن ہے انکی انکو بھاتی ہے
یہی ہے یہ رات کو سنتے ہیں دن کو بھاتی ہے   یہ وہ ہیں نالہ مظلوم کی لے جن کو بھاتی ہے
یہ راگ ان کو سنائے گا یتیم ناتواں کب تک

کسی ترکیب سے آخر ہمیں معلوم کچھ تو ہو   کوئی ہمدرد اپنا ہو کوئی دل سوز اپنا ہو
تو اک پیغام پہنچانے کی ہم تکلیف دیں اس کو   کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو
یہ ظلم آرائیاں کب تک یہ حشر انگیزیاں کب تک

سنائی کے نہ ہونے کی کہو تو انتہا تا کے   کئے جائے گا اک رنجور فریاد وبکا تا کے
ہوئے جائیں گے اک مظلوم پر جورو جفا تا کے   یہ جوش انگیزی طوفان بیدادو بلا تا کے
یہ لطف اندوزئے ہنگامہ آہ وفغاں کب تک

ہماری بھی تمہاری بھی قضا اک روز آنی ہے   نہیں رہنے کی شے یہ جان ناتواں اک روز جانی ہے

سنا بھی تم نے یہ اتمام حجت کی کہانی ہے   یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک

کبھی حالت کسی کی غیر گر تم نے نہیں دیکھی   مسلمانو! لاش بے سر پیر گر تم نے نہیں دیکھی
دکھا تو دی تمہیں اب خیر گر تم نے نہیں دیکھی   نگارستان خوں کی سیر گر تم نے نہیں دیکھی
تو ہم دکھلائیں تم کو زخم ہائے خوں فشاں کب تک

بلاد مصر کے فرماؤ، ویراں چاہئیں تم کو   پٹے لاشوں سے کے کے میل میداں چاہئیں تم کو
کہو تو کتنے پر گنتی میں زنداں چاہئیں تم کو   یہ مانا گرمی محفل کا ساماں چاہئیں تم کو
دکھائیں ہم تمہیں ہنگامہ آہ وفغاں کب تک

زباں سے حرف بھی گر قصہ غم کا نکلتا ہے   کلیجے میں کوئی چٹکی سی لیتا ہے مسلتا ہے
ہمارے حال پر عالم کف افسوس ملتا ہے   یہ مانا قصہ غم سے تمہارا جی بہلتا ہے
مگر تم کو سنائیں درد دل کی داستاں کب تک

ہوا جاتا ہے قامت خم ہری سرسبز ڈالی کا   غم جاں کاہ ہے ہم کو ہماری نونہالی کا
ٹھکانا کیا تمہاری جور وبیداد خیالی کا   یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا
ہم اپنے خون سے سینچیں تمہاری کھیتیاں کب تک

جو دشواری ہماری ہے اسے سمجھے ہو تم آساں   کرو انسانیت کی بات بھی تم ہو اگر انساں
تم اپنی زیب وزینت کے نکالو اور کچھ ساماں   عروس بخت کی خاطر تمہیں درکار ہے افشاں
ہمارے ذرہ ہائے خاک ہوں گے زر فشاں کب تک

قضا کے ہاتھ میں تھا انتظام فتح ایوبی   وگرنہ ہم کہاں اور انصرام فتح ایوبی
نہ لو تیرہ صدی کے بعد نام فتح ایوبی   کہاں تک لوگے ہم سے انتقام فتح ایوبی
دکھاؤ گے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں کب تک

سمجھ کر یہ کہ یورپ بھر کے اندر ناتواں ہیں ہم   سمجھ کر یہ کہ بیمار ونزار ونیم جاں ہیں ہم
سمجھ کر یہ گھڑی ساعت کے گویا میہماں ہیں ہم   سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشان رفتگاں ہیں ہم

مٹاؤ کے ہمارا اس طرح نام ونشاں کب تک

نہ بازو میں توانائی نہ تن میں تاب وطاقت ہے   بزرگوں کی نشانی تم میں باقی اک شجاعت ہے
اسی سے کام لینا چاہئے یہ وقت ہمت ہے   زوال دولت عثماں زوال شرع ملت ہے
عزیز وفکر فرزند وعیال و خا نماں کب تک

سمجھ سے کام جب تم لوتو پھر دشواریاں کیا ہیں   نہ سمجھو جان کو جب جان پھر ناچاریاں کیا ہیں
یہ چالیں کون سی چالیں ہیں یہ مکاریاں کیا ہیں   خدارا تم یہ سمجھے بھی کہ یہ تیاریاں کیا ہیں
نہ سمجھے اب تو پھر سمجھو گے تم یہ چیستاں کب تک

اگر شمشیر غازی کا دل مشرک سے ڈراٹھے   تو سرکوبی کو اس کی گوشہ عالم سے سر اٹھے
نہ آئے وقت وہ یارب کہ بیٹھے خیر شراٹھے   پرستاران خاک کعبہ دنیا سے اگر اٹھے
تو پھر یہ احترام سجدہ گاہ قدسیاں کب تک

گو وجود ہوتا آیا ہے تمہارے جد وآبا سے   لہوان کا پیو جو ہیں تمہارے خون کے پیاسے
خدارا دولت عثماں کو مٹنے دو نہ دنیا ہے   جو گونج اٹھے گا عالم شور ناقوس کلیسا سے
تو پھر یہ نغمہ توحید و گلبانگ اذاں کب تک

قبہ اسلام کی دو دولتیں کیسی ہوئیں نامی   سبب کیا تھا یہی نقصان ہمت عقل کی خامی
الہ العالمین اس معرکے میں ہو نہ ناکامی   بکھرتے جاتے ہیں شیرازۂ اوراق اسلامی
چلیں گی تند باد کفر کی یہ آندھیاں کب تک

سوئے بیت المقدس رہزنوں کی صاف راہیں ہیں   کلیسا ہیں زیادہ کم مقدس خانقاہیں ہیں
مسلمانوں کی ناصر ہیں تو خالق کی پناہیں ہیں   حرم کی سمت بھی صیدافگنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغان حرم کا آشیاں کب تک

کہ ہردم دل کے بہلانے کو زیرآسماں جائیں   ملے آرام وراحت کی جگہ تو ہم وہاں جائیں
کہاں سائل بتاؤ چھوڑ کر ہندوستاں جائیں   جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلی ہم کہاں جائیں
کہ اب امن وامان شام ونجد وقیرواں کب تک

(اولڈ بوائے، علی گڑھ، فروری ۱۹۱۳ء ص ۳۷-۴۱)

[۵]

نورلدھیانوی کی تضمین

نورلدھیانوی [۱۹۰۲-۱۹۶۷ء] لدھیانہ پنجاب کے ایک ممتاز شاعر و ادیب تھے۔ ان کے دو شعری مجموعے ''گلدستہ نور'' اور ''نغمات نور'' شائع ہوئے۔ انہوں نے افسانے، ڈرامے اور غیر افسانوی نثر بھی لکھی ہے۔ ان کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔ لیکن ان کی اصل شہرت اور ناموری ان کی شاعری کی بدولت قائم ہوئی۔

نورلدھیانوی بلا کے ذہین شخص تھے۔ انہیں شاعری سے ایسا شغف ہوا کہ اپنا سب کچھ اسی کی نذر کر دیا۔ انہوں نے متعدد نظمیں اور غزلیں کہی ہیں بلکہ تقریباً ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کے نمونے ان کے مجموعہ کلام میں نظر آتے ہیں۔ اسی طرح ان کا ایک میدان تضمین نگاری بھی ہے بلکہ اس معاملہ میں وہ اپنے معاصرین میں خاصے ممتاز نظر آتے ہیں۔ انہوں نے شبلی و اقبال کی متعدد اور دیگر شعرا کی ایک ایک یا دو-دو نظموں پر تضمین کی ہے۔ سب سے زیادہ علامہ سر محمد اقبال [۱۸۷۷-۱۹۳۸ء] کے کلام پر تضمین ان کے مجموعہ کلام ''نغمات نور'' میں شامل ہے۔ علامہ شبلی کی تین مشہور نظموں پر انہوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے مطالعہ کے بعد کہا جا سکتا ہے کہ حق تو انہوں نے ادا ہی کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ غضب کی شوخی اور دلچسپی پیدا کی ہے۔

علامہ شبلی کی ایک اور بہت مشہور نظم 'عدل جہاں گیری' ہے۔ یہ ان کی منظومات میں خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہی سبب ہے کہ یہ جس زمانہ میں شائع ہوئی بے حد مقبولیت پائی اور آج بھی اہل ذوق کی زبان پر ہے۔ اس کو ہند و پاک کے متعدد رسائل و جراید نے نقل کیا اور بار ہا

شائع کیا۔نورلدھیانوی نے اس تضمین کوسات حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

عدل جہاں گیری

پہلا حصہ

تھے شہنشاہ جہاں گیر رعایا پرور اور رکھتے تھے وہ انصاف پسندانہ نظر
ہیبت شاہ سے تھراتے تھے دیوارودر قصر شاہی میں کہ ممکن نہیں غیروں کا گذر
ایک دن نور جہاں بام پہ تھی جلوہ فگن

سچ تو یہ ہے نہیں مٹ سکتا تھا مقدر کا لکھا ہونا ہوتا ہے جو وہ ہو کے ہے آخر رہتا
بام پہ سیر میں جب محو تھی وہ ماہ لقا کوئی شامت زدہ رہ گیر ادھر آنکلا
گرچہ تھی قصر پہ ہر چار طرف سے قدغن

بام سے بام فلک تک تھا عجب نظارہ جس طرح چودہویں کا چاند ہو جلوہ آرا
آنکھ اٹھا کر جو لگا دیکھنے وہ بے چارا غیرت حسن سے بیگم نے طپنچہ مارا
خاک پر ڈھیر تھا اک کشتہ بے گوروکفن

دوسرا حصہ:

رہ گئے تھام کے دل دیکھنے والے یکسر جمع ہونے لگے رہ گیر سر راہ گذر
ہوا اس بات سے آگاہ جو ہر فرد وبشر ساتھ ہی شاہ جہاں گیر کو بھی پہنچی خبر
غیظ سے آگئی ابروئے عدالت پہ شکن

خوف سے کانپتے تھے ساکن ایوان شہی بید کی طرح لرزنے لگے دربان شہی
شاہ نے دیکھا کہ رہتی ہے یونہی شان شہی حکم بھیجاکے کنیزان شبستان شہی
جاکے پوچھ آئیں کہ سچ یا کہ غلط ہے یہ سخن

تیسرا حصہ:

جب حرم میں یہ شہنشاہ کا فرمان پہنچا غورسے اس گل خوبی نے ہراک لفظ سنا
لیکن افسوس نتیجے کو نہ سوچا سمجھا نخوت حسن سے بیگم نے بصد ناز کہا

میری جانب سے کرو عرض بہ آئین حسن

مجھ کو سچ بات کے اظہار میں کچھ عار نہیں   نہیں! اے شاہ جہانگیر وجہاں دار نہیں
طالب صدق ہوں باطل کی طرف دار نہیں   ہاں مجھے واقعہ قتل سے انکار نہیں
مجھ سے ناموس حیا نے یہ کہا تھا کہ بزن

دامن صبر وتحمل میرا کیوں ہوتا نہ چاک   ٹکٹکی باندھے ہوئے گھور رہا تھا ناپاک
تھا وہ بد باطن و بے شرم نہایت بیباک   اس کی گستاخ نگاہی نے کیا اس کو ہلاک
کشور حسن میں جاری ہے یہی شرع کہن

چوتھا حصہ:

عدل وانصاف کی حد ہوگئی اللہ اللہ   جذبہ عشق کیا حق و صداقت پہ فدا
دل نوازی ومحبت کا نہ کچھ پاس کیا   ''مفتی دیں سے شہنشاہ نے فتوی پوچھا''
کہ شریعت میں کسی کو نہیں کچھ جائے سخن

اس نے فرمان شہی کا جو تقاضا پایا   واقعہ سنتے ہی پہلے تو بہت گھبرایا
دیر تک سوچتا انگشت بدنداں ہی رہا   ہوکے بےخوف وخطر صاف پھر اس نے کہا
شرع کہتی ہے کہ قاتل کی اڑادو گردن

فیصلہ سننے جو آئے تھے وہ گھبرا اٹھے   جو تماشائی تھے خودبن کے تماشا اٹھے
جو نمک خوار حکومت تھے وہ چلا اٹھے   اہل دربار سب اس حکم سے تھرا اٹھے
پر جہاں گیر کے ابرو پہ نہ بل تھا نہ شکن

چشمہ چشم میں گو جوش اٹھارہ رہ کر   پر محبت کو نہ آنے دیا غالب حق پر
چونکہ انصاف شہنشاہ کو تھا مد نظر   ترکنوں کو یہ دیا حکم کہ اندر جا کر
پہلے بیگم کو کریں بستہ زنجیر و رسن

اور فرمایا کہ مت رعب میں اس کے آئیں   آہ وزاری بھی کرے رحم نہ ہرگز کھائیں
ہتھکڑی ہاتھ میں بےخوف وخطر پہنائیں   پھر اسی طرح اسے کھینچ کے باہر لائیں

اور جلاد کو دیں حکم کہ ہاں تیغ بزن

پانچواں حصہ:

جس سے سرتابی کی شہ کو بھی کبھی تاب نہ تھی   جس کے فرماں سے نہ تھی جرات انکار کبھی
جو شہنشاہ کے دل پر تھی حکومت کرتی   ''یہ وہی نور جہاں ہے کہ حقیقت میں یہی''
''تھی جہانگیر کے پردے میں شہنشاہ زمن''

آج یہ دن ہے کہ بے طرح ہے برباد و تبہ   یاس آتی ہے نظر اٹھتی ہے جس سمت نگہ
وہ بھی اک وقت تھا جس وقت کہ اللہ اللہ   ''اس کی پیشانی نازک پہ جو پڑتی تھی گرہ''
جا کے بن جاتی تھی اوراق حکومت پہ شکن

ڈال کر چرخ ستمگار نے بے طرح فتور   کردیا بیگم خودبیں کو بہت ہی مجبور
قہرماں کل تھی جو وہ آج ہوئی ہے مقہور   اب نہ وہ نور جہاں ہے نہ وہ انداز وغرور
اب نہ وہ غمزے نہ وہ عربدہ صبرشکن

چھٹا حصہ:

جب یہ دیکھا کہ شریعت کے ہیں ناطق احکام   اوراس جرم کا بیشک ہے ہلاکت انجام
غوراورفکر سے لیتے ہوئے بالآخر کام   ''بھیجا بیگم نے یہ پھر شاہ کی خدمت میں پیام''
''خوں بہا بھی تو شریعت میں ہے اک امر حسن''

شاہ نے نور جہاں کا جو یہ پیغام سنا   عام دربار لگانے کا یہ اعلان کیا
جمع جس وقت وہاں ہوگئے ارباب صفا   مفتی شرع سے پھر شاہ نے فتوی پوچھا
''بولے جائز ہے رضامند ہوں گر بچہ وزن''

ساتواں حصہ:

جمع اک جا کئے پھر اہل حرم بیگم نے   کرکے سراپنا پشیمانی سے خم بیگم نے
عجز والحاح سے بادیدۂ نم بیگم نے   وارثوں کو جو دئے لاکھ درم بیگم نے
سب نے دربار میں کی عرض کہ اے شاہ زمن

مطمئن خوں بہا لے کر ہوئے ہم سب اشخاص قتل بیگم سے نہیں ہم کو کوئی فائدہ خاص
آپ کا عدل ہے سرمایہ مہر و اخلاص ہم کو مقتول کا لینا نہیں منظور قصاص
''قتل کا حکم جو رک جائے تو ہے مستحسن''

سن کے یہ بات ہوئے شاہ بہت خندہ جبیں اور پھر غور کیا تا کہ نہ ہو جھوٹ کہیں
وارثوں نے جو ہر اک طور سے کر دی تسکیں ''ہو چکا جبکہ شہنشاہ کو پورا یہ یقیں
''کہ نہیں اس میں کوئی شائبہ حیلہ و فن''

ہوگئی پوری تسلی تو ہوا دور الم اور مسرت سے ہوا گرم عطا دست کرم
سب کو رخصت کیا انعام دئے دام و درم ''اٹھ کے دربار سے آہستہ چلا سوئے حرم''
تھی جہاں نور جہاں معتکف بیت حزن

نوؔر انصاف نے اعجاز دکھائے کیا کیا بیگم شاہ کجا ، جرم کجا ، حکم کجا
شاہ پھر فرط محبت سے جو بیتاب ہوا ''دفعتاً پاؤں پہ بیگم کے گرا اور کہا''
''تو اگر کشتہ شدی آہ! چہ می کردم من''

(نغمات نور ص ۲۷-۳۴)

عدل جہاں گیری ہی کی طرح عدل فاروقی بھی علامہ شبلی کی بہت شاندار اور مقبول ترین نظم ہے۔ جناب نور لدھیانوی نے اسے بھی تضمین کے مرحلہ سے گذارا ہے۔ نظم طویل ہے تو اس کی تضمین بھی طویل ہوگئی ہے۔

عدل فاروقی

پہلا حصہ

کتنے اسلام کے روشن تھے قرون اولیٰ جملہ مسلم تھے اولی الامر کی بزم شوریٰ
جمع جب صحن میں مسجد کے تھے سب اہل صفا ''ایک دن حضرت فاروق نے ممبر پہ کہا''
''میں حکم جو کچھ دوں تو کروگے منظور''

خم ہوئے پاس ادب سے پئے تسلیم سبھی منتظر سننے کو احکام تھے مردان جری

کہنے پائے بھی نہ تھے آپ کوئی بات ابھی ایک نے اٹھ کے کہا ہم نہیں مانیں گے کبھی
''کہ تیرے عدل میں ہم کو نظر آتا ہے فتور''

چیزیں جو جنگ سے ہاتھ آئیں ہمیں دکھلائیں مال خانے میں یہ مانا کہ وہ سب پہنچائیں
یہ بھی تسلیم کہ حقداروں کو بھی دلوائیں ''چادریں مال غنیمت میں جو ایک آئیں''
''صحن مسجد میں وہ تقسیم ہوئیں سب کے حضور''

منصفی تیری دل وجان سے ہم کو بھائی تیرے انصاف سے عالم نے ہے زینت پائی
اب کے زاید ہی دیا اور نہ کمی دکھلائی ان میں ہر ایک کے حصہ میں تھی اک اک آئی
''تھا تمہارا بھی وہی حق کہ یہی ہے دستور''

مجھ کو جس بات کا اس وقت ہوا ہے احساس شرط انصاف یہ ہے اس کا کریں آپ بھی پاس
ہے یقیں ہو نہیں سکتا یہ غلط تیرا قیاس ''اب جو یہ جسم پہ تیرے نظر آتا ہے لباس''
''یہ اسی لوٹ کی چادر سے بنا ہوگا ضرور''

میں نہ جھوٹا ہوں نہ حاسد ہوں نہ ہوں میں غماز سچ جو پوچھو تو ہے حق گوئی پہ اپنی مجھے ناز
بات یہ صاف ہے مخفی نہیں اس میں کوئی راز ''مختصر تھی وہ ردا اور تیرا قد ہے دراز''
''ایک چادر سے تیرا جسم نہ ہوگا مستور''

عدل کو تو نے دیا ہاتھ سے اے فخر عرب اور پھر ہم بتایا بھی نہیں اس کا سبب
تو ہی انصاف سے کہہ دے کہ یہ انصاف ہے کب ''اپنے حصے سے زیادہ جو لیا تو نے تو اب''
''تو خلافت کے نہ قابل ہے نہ ہم ہیں مامور''

دوسرا حصہ:

نہ اسے خوف تھا کوئی نہ وہ گھبراتا تھا یعنی حق بات کے کہنے میں نہ شرماتا تھا
سب کو اس گرمی تقریر سے گرماتا تھا ''گرچہ وہ حد مناسب سے بڑھا جاتا تھا''
''سب کے سب مہر بہ لب تھے چہ اناث و چہ ذکور''

حق پرستوں کو تھا حق بات کا اس درجہ خیال اس کے اصرار کا تھا رنج کسی کو نہ ملال

یہ تو سب کچھ تھامگراس پہ بھی تھاایساحال ''روک دے کوئی کسی کو یہ نہ رکھتاتھامجال''
''نشہ عدل ومساوات سے تھے سب مخمور''

تیسرا حصہ:

راستی اور حلیمی یہ کہ اللہ اللہ آپ نے غور سے اس شخص کا ہر لفظ سنا
کرکے جب ختم وہ تقریر کو خود بیٹھ گیا ''اپنے فرزند سے فاروقؓ معظم نے کہا''
''تجھ کو ہے حالت اصلی کی حقیقت پہ عبور

اتفاقاً یہاں موجود ہیں سارے احباب جمع مسجد میں ہیں اس وقت مکرم اصحاب
بات دراصل جو سچی ہے بیاں کردو شتاب دے سر بزم تو اس کا میری جانب سے جواب
''کہ نہ پکڑے مجھے محشر میں میرارب غفور''

چوتھاحصہ

جمع تھے اہل خیال ، اہل کمال ، اہل نظر مئے توحید سے لبریز تھے سب کے ساغر
سب کے سب ہوگئے انگشت بدنداں سن کر ''بولے جب ابن عمران سے مخاطب ہوکر''
''کہ نہیں اس میں کوئی والد ماجدکاقصور''

میری سچائی کا لازم ہے تمہیں ہو احساس ہے نہ دھوکا نہ فریب اس میں نہ کچھ باپ کا پاس
بات سچ کہتا ہوں میں آپ سے بےخوف و ہراس ''ایک چادر سے جو پورا نہ ہوا ان کا لباس''
''کرسکی اس کو گوارا نہ میری طبع غیور''

تھایہی مجھ کومناسب مجھے واجب تھایہی میرے ہوتے ہوئے تکلیف انہیں ہونہ کوئی
اورتوہونہ سکامجھ سے کچھ اے میرے اخی ''اپنے حصہ کی بھی چادر انہیں میں نے دیدی''
''واقعہ کی یہ حقیقت ہے کہ جو تھی مستور''

پانچواں حصہ:

ہوگا منصف کوئی تجھ جیسا کہاں اے فاروقؓ تیری توصیف ہو کس طور بیاں اے فاروقؓ
تھا سراپا ہی غلط وہم وگماں اے فاروقؓ نکتہ چیں نے یہ کہااٹھ کے کہ ہاں اے فاروقؓ

''حکم دے ہم کو کہ اب ہم اسے مانیں گے ضرور''

چونکہ شاعر نے ہر مصرعے پر تضمین کی ہے اس لئے یہ تضمین خاصی طویل ہوگئی ہے تاہم اس کے مطالعہ کا اصل لطف اور تسکین ذوق کا سامان پوری نظم کے یکجا مطالعہ ہی میں پوشیدہ ہے۔

علامہ شبلی نعمانی کی تیسری مشہور نظم جسے جناب نور لدھیانوی نے تضمین کے لئے منتخب کیا وہ ''ایثار کی اعلیٰ ترین نظیر'' ہے۔ بلاشبہہ یہ نہ صرف علامہ شبلی کی بلکہ اردو زبان کی چند ممتاز ترین نظموں میں سے ایک ہے۔ ملاحظہ ہو:

ایثار کی اعلیٰ ترین نظیر

[تضمین بر نظم حجۃ الملۃ والدین شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی]

پہلا حصہ

جوش میں آ گئے جس وقت مسلمان غیور پھر تو ہونے لگے پامال ستم گر مغرور
اور کچھ بن نہ پڑی ان کو تو ڈالا یہ فتور کر دیا کافروں نے جنگ احد میں مشہور
''کہ پیمبر بھی ہوئے کشتۂ شمشیر دوم''

چونکہ تھی ان کے یہی بات فقط پیش نظر حوصلے پست ہوں توحید پرستوں کے اگر
غالب آ جائے گا مسلم پہ ہمارا لشکر ''ہو کے مشہور مدینے میں جو پہنچی یہ خبر''
''ہر گلی کوچہ تھا ماتم کدۂ حسرت وغم''

سن کے اس بات کو ٹکڑے ہوئے امت کے جگر عالم یاس تھا جس سمت بھی اٹھتی تھی نظر
لوگ سب بادل صد پارۂ وبادیدۂ تر ''ہو کے بیتاب گھروں سے نکل آئے باہر''
''کودک وپیر و جواں وخدم وخیل وحشم''

جذبہ یک لخت بھڑک اٹھا جو باطل کے خلاف ہو کے صف بستہ وہ جو شیلے بنے جنگ ومصاف
آئے میدان میں سب بندے کہ تھے نیک اوصاف ''وہ بھی نکلیں کہ جو تھیں پردہ نشینان عفاف''
''جن میں تھیں سیدۂ پاک بھی بادیدۂ نم''

کوئی حیران اگر تھا تو پریشاں کوئی کوئی بیکل کوئی بیتاب مثال ماہی

الغرض بے طرح بے چین سے تھے یوں تو سبھی ''ایک خاتون کہ انصار نکو نام سے تھی''

''سخت مضطرب تھی نہ تھے ہوش وحواس اس کے بہم''

دوڑتی پھرتی تھی ہرسمت بصد آہ وبکا نہ خبر سر کی نہ پاؤں کا پتہ تھا اصلاً

بال بکھرے ہوئے منہ زرد تھا گرد آلودہ ''موقعہ جنگ پہ پہنچی تو یہ لوگوں نے کہا''

''کیا کہیں تجھ سے کہ کہتے ہوئے شرماتے ہیں ہم''

ہے گھٹا یاس کی تیرے لئے ہرسو چھائی تیرے ارمانوں کی دنیا میں قیامت آئی

تیری امید کے گلشن کی کلی مرجھائی ''تیرے بھائی نے لڑائی میں شہادت پائی''

''تیرے والد بھی ہوئے کشتہ شمشیر ستم''

چھن گئی تجھ سے تیرے قفل امید کی کلید نیک خاتون لگی دل پہ تیرے ضرب شدید

راہی خلد بریں ہوگئے مردان سعید ''سب سے بڑھ یہ کہ شوہر بھی ہوا تیرا شہید''

''گھر کا گھر صاف ہوا ٹوٹ پڑا کوہ الم''

دوسرا حصہ:

نہ اسے مرگ برادر کا کوئی صدمہ تھا نہ شہادت کا اسے باپ کی کچھ رنج ہوا

اس نے واللہ کیا غم نہ کوئی شوہر کا ''اس عفیفہ نے یہ سب سن کے کہا تو یہ کہا''

''یہ تو بتلاؤ کہ کیسے ہیں شہنشاہ امم''

تلملاتی تھی تڑپتی تھی ہراساں مہجور وہ اسی غم میں پریشاں تھی اسی فکر میں چور

بادۂ عشق محمدؐ سے سراپا مخمور سب نے اس کو دی بشارت کہ سلامت ہیں حضورؐ

''گرچہ زخمی ہیں سروسینہ وپہلو وشکم''

اس نے خیریت محبوب کا جب مژدہ سنا ہوگیا غنچہ دل اس کا شگفتہ گویا

سر تسلیم کو خم کرکے کیا شکر خدا ''بڑھ کے پھر جب رخ اقدس کو بھی دیکھا تو کہا

''تو سلامت ہے تو پھر ہیچ ہیں سب رنج والم''

تجھ پہ قربان میری جان بھی اور سر بھی فدا جاہ وحشمت بھی فدا مال بھی اور زر بھی فدا

تجھ پہ فرزند جگر بند بھی دختر بھی فدا ''میں بھی اور باپ بھی شوہر بھی برادر بھی فدا''
''اے شہ دیں تیرے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم''

(نغمات نور ص۹۷-۱۰۰)

۱۹۱۳ء میں علامہ شبلی کو بادل ناخواستہ ندوۃ العلما کو خیرباد کہنا پڑا تو انہوں نے طلبہ کو مخاطب کر کے یہ قطعہ کہا تھا کہ

کئے تھے ہم نے بھی کچھ کام جو کچھ ہم سے بن آئے
یہ قصہ جب کا ہے باقی تھا جب عہد شباب اپنا
اور اب تو سچ یہ ہے جو کچھ امیدیں ہیں وہ تم سے ہیں
جواں ہو تم لب بام آچکا ہے آفتاب اپنا

ایک صدی بعد نوجوان اہل قلم ،شاعر و ادیب اور ہمارے کرم فرما ڈاکٹر تابش مہدی کے صاحبزادے مولانا شاہ محمد اجمل فاروق ندوی نے طلبائے ندوہ کی طرف سے علامہ شبلی کو یہ یقین دلایا ہے کہ

کریں گے ہم بھی اب کچھ کام جو کچھ ہم سے بن آئیں
ابھی تو عمر ہے باقی ہے اور ہے عہد شباب اپنا
ہے وعدہ حضرت شبلی کی روح پاک سے اجمل
کریں گے جہد جب تک ڈھل نہ جائے آفتاب اپنا

یہ تازہ تضمینی کلام اس بات کی دلیل ہے کہ علامہ شبلی نے نہ صرف نسلوں کو متاثر کیا بلکہ اثر انگیزی کا یہ سلسلہ ہنوز کسی نہ کسی نوع سے جاری ہے۔یقین ہے آئندہ بھی یہ شمع روشن رہے گی۔

غرض علامہ شبلی کی نظمیں عوام وخواص کے سوا شعراء وادباء کے درمیان بھی دلچسپی کا مرکز رہیں۔یہ نظمیں اپنی تاریخی حیثیت کے سوا تضمین نگاری کے لحاظ سے بھی منفرد درجہ رکھتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ علامہ اقبال کے سوا اردو ادب میں شاید ہی کوئی ایسا نظم نگار ہوگا جس کی نظموں کی اس قدر اہتمام سے تضمین کی گئی ہو۔اور اسی بلند فکر وخیال اور اسی بحر وعروض میں طبع آزمائی کی گئی ہو

جس میں خود نظم نگار علامہ شبلی نے کی تھی۔

[۶]

علامہ شبلی اور مدرسۃ الاصلاح

مدرسۃ الاصلاح ایک سراج منیر ہے۔ یہ خطہ اعظم گڑھ کی آرزو بھی ہے اور آبرو بھی۔ یہ محض ایک مدرسہ نہیں بلکہ دیار پورب کے چند بہی خواہ علماء کی یادگار اور ایک دینی تحریک ہے۔ جہان فکر و دانش ہے۔ اس کے قیام، بقا اور استحکام میں ہمارے بزرگوں کا خون جگر اور ایک صدی کی جدوجہد شامل ہے۔

داتا رکھے تجھے آباد صبح محشر تک

مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ ۱۹۰۸ء میں قائم ہوا۔ اس کے بانی مولانا محمد شفیع خانؒ [۱۸۶۶-۱۹۴۵ء] کی ذات گرامی سراپا اخلاص و عمل تھی۔ (۱) ان کے احباب بھی پیکر صدق و صفا تھے۔ انہیں بزرگوں اور خدا رسیدہ اسلاف نے اصلاح معاشرہ کے تصور سے ۱۹۰۴ء میں انجمن اصلاح المسلمین قائم کی (۲) اور بیداری امت کے لئے جدوجہد کا آغاز کیا۔ اولاً جلسوں کا اہتمام کیا۔ دور دراز مقامات سے علماء و مشائخ اور اہل علم کو دعوت و تبلیغ کے لئے دعوت دی، جس میں ہندوستان کے بہت سے ممتاز علماء نے شرکت کی۔ علامہ شبلی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء]، مولانا عبید اللہ سندھی [۱۸۷۲-۱۹۴۴ء]، مولوی عبدالحق حقانی [م:۱۹۶۹ء]، مولانا ثناء اللہ امرت سری [۱۸۶۸-۱۹۴۸ء] اور بہت سے بزرگوں کی شرکت کی صراحت کتابوں میں جا بجا ملتی ہے۔ (۳)

انجمن اصلاح المسلمین اگرچہ اصلاح معاشرہ کے لئے وجود میں آئی تھی، مگر دراصل اس کے بانی کے پیش نظر بڑے وسیع مقاصد تھے۔ ان میں ایک مقصد ''مذہبی و دنیوی تعلیم کی غرض سے

جا بجا مدارس کا اجرا اور موجودہ تعلیم گاہوں کی اصلاح واعانت'' بھی تھا۔(۴)

چونکہ انجمن کی تاریخ اور خدمات کی تفصیل دستیاب نہیں ہے اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انجمن اصلاح المسلمین نے کیسی عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں، تاہم یہ خود بہت اہم اور قابل ذکر بات ہے کہ اس نے اصلاح معاشرہ کے ساتھ مدرسۃ الاصلاح کی بناوتاسیس کا لائق تحسین اور تاریخی کارنامہ ہے۔

انجمن اصلاح المسلمین اور مدرسۃ الاصلاح پر گردش زمانہ کی ۱۱۷ بہاریں گذر چکی ہیں۔ مختلف مراحل سے گذرنے کے بعد مدرسۃ الاصلاح آج ہماری تاریخ کا ایک روشن مینار ہے۔ ایک صدی سے زاید مدت سے علوم قرآنی کا یہ مرکز اپنی خدمات اس طرح انجام دے رہا ہے کہ سیکڑوں نہیں ہزاروں نے اپنی علمی تشنگی بجھائی ہے اور اس کی خاک سے بعض ایسے ارباب کمال اٹھے جنہوں نے زمانے کو سیراب کیا ہے۔

اس خطہ اعظم گڑھ کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے قیام کے محض سات سال بعد ۱۸۷۳ء میں حجۃ الملۃ والدین علامہ شبلی نعمانی کے والد شیخ حبیب اللہ وکیل (۵) نے جنہیں ایک بزرگ الٰہی شاہ (۶) سے بیعت وارادت کا شرف حاصل تھا، اعظم گڑھ شہر میں ''مدرسہ عربیہ'' کی بنیاد ڈالی اور تعلیم وتدریس کے لئے مولانا فیض اللہ مئوی [۱۸۱۵ - ۱۸۹۸ء] اور مولانا محمد فاروق چریا کوٹی [م: ۲۷/اکتوبر ۱۹۰۹ء] کو استاذ مقرر کیا۔ شیخ حبیب اللہ نے یوں تو یہ سارے جتن اپنے لخت جگر شبلی نعمانی کی تعلیم وتربیت کے لئے کئے تھے مگر اس سے دوسرے اہل ذوق نے بھی استفادہ کیا۔ ان میں مشہور مجاہد آزادی ڈاکٹر مختار احمد انصاری [۱۸۸۰-۱۹۳۶ء] کے بھائی حکیم عبدالوہاب نابینا [م: مئی ۱۹۴۱ء] کے نام کی صراحت ملتی ہے۔(۷)

اس زمانہ میں شیخ حبیب اللہ اپنے پیر ومرشد الٰہی شاہ اور تصوف سے اس درجہ متاثر تھے کہ انہوں نے بیٹوں کے نام شبلی وجنید رکھے اور انہیں دینی تعلیم دلائی۔ علامہ شبلی کی دینی تعلیم کے بعد ان کے چھوٹے بھائی محمد مہدی حسن [م: ۲۹/جون ۱۸۹۷ء] بھی جو اس وقت حافظ قرآن ہو چکے تھے اور عربی و فارسی کی روایتی تعلیم کی تحصیل میں مصروف تھے۔ اسی زمانہ میں سرسید احمد خاں

[۱۸۱۷-۱۸۹۸ء] کی تحریک علی گڑھ برپا ہوئی اوراس کا آوازہ سارے ہندوستان میں بلند ہوا۔

مدرسہ عربیہ اعظم گڑھ کے قیام کے محض ایک سال بعد ۱۱رمئی ۱۸۷۴ء کو ایم اے او کالج علی گڑھ کے قیام کے سلسلہ میں سرسید اعظم گڑھ تشریف لائے اور جدید تعلیم کا صور اس زور اور بلند آہنگی سے پھونکا کہ یہ پورا علاقہ ان کے زیر نگیں آ گیا۔اس موقع پر انہوں نے مسلمانان اعظم گڑھ کے سامنے جو خطبہ دیا تھا اور جسے راقم نے سوا سو سال بعد سائنٹی فک سوسائٹی کے اوراق سے تلاش کر کے ماہنامہ معارف میں شائع کرا دیا ہے۔(۸) اس خطبہ کے ایک ایک حرف سے ان کی ملی دردمندی جھلکتی ہے۔واقعہ یہ ہے کہ سرسید ملت میں جدید شعور و دانش کے بانی ہیں۔ان کا خطبہ بھی اس کا شاہد ہے۔ یہ خطبہ راجہ سلامت علی خاں اور اردو ناول نگاری کے باوا آدم اور اس وقت کے اعظم گڑھ کے ڈپٹی کلکٹر مولوی نذیر احمد دہلوی[۱۸۳۶-۱۹۱۲ء] کی صدارت میں دیا گیا تھا اور اسی زمانہ میں اخبار سائنٹی فک سوسائٹی علی گڑھ، ۲۱راگست ۱۸۷۴ء (ص ۵۳۰-۵۳۶) میں شائع ہوا تھا۔اب اسے راقم کے مجموعہ مضامین 'قد اور سائے' میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔(۹)

مدرستہ العلوم علی گڑھ کے قیام کے بعد علامہ شبلی اور ان کے والد نے علی گڑھ کا سفر کیا جس کا ذکر سرسید نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ (۱۰) میں کیا۔ بعد ازاں ۱۸۸۳ء میں علامہ شبلی بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر فارسی ایم اے او کالج سے وابستہ ہوئے اور پھر اسی سال انہوں نے اعظم گڑھ میں نیشنل اسکول قائم کر کے تحریک علی گڑھ کو خطہ اعظم گڑھ میں مزید مؤثر بنا دیا اور یہی وہ سال ہے جس میں علامہ شبلی نے اعظم گڑھ میں ''مجلس موازنہ ترقی قومی'' قائم کر کے علاقہ اور برادری کی تعلیم و ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے نہ صرف اپنی فکرمندی کا اظہار کیا بلکہ اس کا ایک مستقل نظام قائم کیا۔مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں لکھا ہے کہ علامہ شبلی نے:

> ''برادری کے لوگوں کی سالانہ ترقی کی جانچ کے لئے ''موازنہ ترقی قومی'' کے نام سے ایک مجلس کی بنیاد ڈالی، جس کی طرف سے ہر سال برادری کی تعلیمی ترقی کی روداد مرتب ہوتی اور لوگوں میں تقسیم ہوتی۔''(۱۱)

مولوی محمد سمیع صاحب مرحوم موضع کنورہ گہنی کے باشندہ اور علامہ شبلی کے ابتدائی دور کے

احباب میں تھے اور جو عرصہ تک جون پور میں محافظ دفتر رہے، علامہ شبلی نے انہیں مجلس موازنہ ترقی قومی کا سکریٹری نامزد کیا تھا۔ اس عہدہ پر وہ برسوں خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۹۰۵ء تک یہ مجلس موازنہ ترقی قومی قائم رہی۔ اس کی جستہ جستہ تفصیلات مکاتیب شبلی اور حیات شبلی وغیرہ میں ملتی ہیں مگر تعجب ہوتا ہے کہ ۱۸۸۳ء سے ۱۹۰۵ء تک یعنی ۲۲ رسال قائم رہنے کے باوجود اس مجلس کی کوئی تاریخ یا روداد کہیں دستیاب نہیں ہے۔ مکاتیب شبلی اور حیات شبلی کے علاوہ کسی اور ذرائع سے اس کا کہیں ذکر نہیں ملا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ دور میں ہم اور ہماری ملت جس بے حسی کے شکار ہیں، اس دور میں بھی ہم غالبًا ایسے ہی تھے۔ البتہ یہ یقینی ہے کہ مجلس موازنہ ترقی قومی کے اثرات ضرور مرتب ہوئے، اس لئے کہ انجمن اصلاح المسلمین کے بانیوں کے پیش نظر بھی علاقہ کی تعلیمی پس ماندگی اور معاشرتی اصلاح اور تعلیمی ترقی ہی تھی۔ (۱۲)

یہی وہ زمانہ ہے جس میں مولانا محمد شفیع خاںؒ اور بعض دوسرے بزرگوں نے گاؤں گاؤں بیداری کا صور پھونکا۔ ذہنی اور فکری ہم آہنگی کی بنا پر علامہ شبلی بھی انجمن اصلاح المسلمین کے بعض اجلاسوں میں شریک ہوئے اور بقول مولانا سید سلیمان ندوی [۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] انجمن اصلاح المسلمین ہی کے ایک اجلاس میں مولانا عبید اللہ سندھیؒ سے ان کی ملاقات ہوئی اور تخلیہ میں گفتگو رہی۔ (۱۳) دونوں بزرگوں میں اخیر تک گہرے مراسم قائم رہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی میں قائم کیا تو علامہ شبلی نے اس کے ملاحظہ کے لئے دہلی کا سفر کیا اور اس کے متعلق انہوں نے اپنی جو رائے شائع کرائی ہے اس میں لکھا ہے کہ یہ ہمارے نقطہ نظر کا ایک نمونہ ہے۔ (۱۴)

بانی مدرسۃ الاصلاح مولانا محمد شفیع خاں علامہ شبلی سے بڑی محبت کرتے تھے اور انہیں انجمن اصلاح المسلمین اور مدرسۃ الاصلاح سے وابستہ کرنے کے لئے برابر فکرمند رہتے تھے۔ اس کے اور اسباب میں علامہ شبلی کی تعلیمات پر گہری نظر اور قومی دردمندی تو تھی ہی ایک سبب یہ بھی تھا کہ دونوں ہم وطن اور استاد بھائی بھی تھے۔ مولانا فیض اللہ مئوی سے دونوں بزرگوں کو شرف تلمذ حاصل تھا۔ علامہ شبلی نعمانی کو مدرسہ عربیہ اعظم گڑھ میں اور مولانا محمد شفیع خاں کو دانا پور بہار

میں(۱۵)۔علاوہ ازیں دونوں بزرگوں میں قدر مشترک یہ بھی تھا کہ اس خطہ اعظم گڑھ کی بیداری اور تعلیمی ترقی کے دونوں خواہاں تھے۔اور دونوں نے جدوجہد کی۔

مدرسۃ الاصلاح کے قیام سے پہلے علامہ شبلی سررشتہ علوم وفنون حیدرآباد کی نظامت سے مستعفی ہوکر ندوہ کے لئے خود کو وقف کر چکے تھے۔۱۹۰۸ء کے بعد ۱۸رنومبر۱۹۱۴ء یعنی اپنی وفات تک مدرسۃ الاصلاح کے ہر طرح کے معاملات و مسائل سے پوری دلچسپی لی اور مسلسل فکرمند رہے۔اسی دلچسپی کا نتیجہ تھا کہ اراکین انتظامیہ نے انہیں سرپرست اور معتمد منتخب کیا۔صاحب ''تذکرہ علمائے اعظم گڑھ'' مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ نے لکھا ہے کہ گو بعض لوگوں کو ان سے اختلاف تھا تاہم انتظامیہ نے اس کی پرواہ نہیں کی اور انہیں سرپرست مقرر کیا۔(۱۶) مدرسۃ الاصلاح سے علامہ شبلی کا تعلق مختلف اور گوناگوں نوعیت کا تھا۔مثلاً:

۱۔علامہ حمیدالدین فراہی[۱۸۸۴-۱۹۳۰ء] کو ایک خط (مرقومہ:۲۹راپریل ۱۹۱۰ء) میں لکھتے ہیں:

> ''کیا تم چندروز سرائے میر کے مدرسے میں قیام کر سکتے ہو؟ میں بھی شاید آؤں۔اس کا نظم ونسق درست کر دیا جائے۔اس کو گروکل کے طور پر خالص مذہبی مدرسہ بنانا چاہیئے، یعنی سادہ زندگی اور قناعت اور مذہبی خدمت اس کا مطمح زندگی ہو۔''(۱۷)

۲۔انہیں کو ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

> ''اسی (مدرسۃ الاصلاح) کو دین و دنیا دونوں کی تعلیم کا مرکز بنایا جائے۔یہیں خدام دین (۱۸) بھی تیار ہوں۔مذہبی اور اعلیٰ تعلیم بھی دلوائی جائے۔گویا گروکل ہو۔تم اپنی رائے لکھو۔............ پرنسپل اور بیش قرار تنخواہ چندروزہ ہیں اور یہ کام ابدی۔''(۱۹)

۳۔علامہ شبلی اپنے ایک اور شاگرد مولوی مسعود علی ندوی[۱۸۸۹-۱۹۶۷ء] کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''دارالمصنّفین درجہ تکمیل، سرائے میر درجہ ابتدائی پورا جامعہ اسلامیہ کا مصالحہ
ہے۔ کام کرنے کی ضرورت ہے۔ سرائے میر والے چند بار آئے، وہ تمہارے
بہت آرزومند ہیں۔ وہاں کے موجودہ ناظم اور بانی مدرسہ مولوی محمد شفیع کی
خواہش ہے کہ تم ناظم یا نائب ناظم بن جاؤ۔'' (۲۰)

ان اقتباسات سے مدرستہ الاصلاح سے ان کی گہری دلچسپی اور فکر مندیوں کی ایک جھلک سامنے آجاتی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے مدرستہ الاصلاح کے متعلق اپنی تحریروں میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے مولانا نسیم ظہیر اصلاحی صاحب نے اس کا خلاصہ کیا ہے جو درج ذیل ہے:

۱۔ خالص مذہبی مدرسہ بنایا جائے۔
۲۔ مذہبی اعلیٰ تعلیم دلائی جائے۔
۳۔ دین و دنیا کی تعلیم کا مرکز بنایا جائے۔
۴۔ خدام دین تیار کئے جائیں۔
۵۔ سادہ زندگی، قناعت اور مذہبی خدمت اس کا مطمح نظر ہو۔
۶۔ مدرستہ الاصلاح اور دارالمصنّفین کے باہمی اشتراک والحاق سے ایک
بڑے جامعہ اسلامیہ کی صورت گری کی جائے۔

علامہ شبلی مدرستہ الاصلاح کے سالانہ اجلاسوں اور مجلس انتظامیہ کے جلسوں میں شریک ہوتے رہے۔ البتہ علامہ شبلی کس سنہ میں اس کے رکن نامزد ہوئے اس کی صراحت نہیں ملتی، تاہم ۲۸/اگست ۱۹۱۰ء سے پہلے وہ اس کے رکن منتخب ہو چکے تھے، اس لئے کہ ۲۸/اگست ۱۹۱۰ء کو مدرستہ الاصلاح کی مجلس انتظامیہ کا جو جلسہ سرائے میر میں منعقد ہوا تھا اس کی صدارت انہی نے فرمائی تھی۔ اس اجلاس کی روداد میں اراکین کی جانب سے کل نو رزولیوشن کے پیش کئے جانے کا ذکر ملتا ہے۔ اس میں ایک قرارداد یا تجویز علامہ شبلی کے قلم سے ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ

''جلسہ میں یہ بات پاس ہوئی کہ ایک جنرل کمیٹی عام افراد قوم کی منعقد کی
جائے، جس میں کم از کم پندرہ دن پہلے میعاد دی جائے اور جو مسائل پیش

ہونے والے ہوں مفصلاً تحریر کئے جائیں۔''

شبلی

۲۸؍اگست ۱۹۱۰ء

۲۸؍اگست ۱۹۱۰ء کے بعد ۳۰؍اکتوبر ۱۹۱۰ء کو مجلس انتظامیہ مرزا محمد نعیم صاحب وکیل (۲۱) کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ گذشتہ اجلاس میں علامہ شبلی کی تجویز پر اس اجلاس میں شاہ محمد اسحاق مرحوم (۲۲) نے ایک نیا رزولیوشن پیش کیا کہ

''یہ مناسب ہے کہ اس کمیٹی میں جناب مولانا شبلی صاحب موجود ہوں۔ اس کی تائید مولوی رشیدالدین صاحب (۲۳) نے کی۔ لہٰذا یہ مسئلہ بلا کسی مخالفت کے پاس ہوا کہ مولانا موصوف کی موجودگی ضروری ہے اور ان سے استدعا کی جائے گی کہ وہ بہت جلد تشریف لائیں اور اپنے آنے کی ایک ماہ قبل اطلاع دیں۔'' (۲۴)

۸؍ ماہ بعد ۸؍ جولائی ۱۹۱۱ء کو مجلس انتظامیہ کا جلسہ محمد خلیل خاں صاحب (۲۵) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس میں نصاب تعلیم کے لئے ایک انجمن کے قیام کی قرارداد حاجی صدر علی (۲۵) نے پیش کی اور مولانا فراہی نے اس کی تائید کی اور بالاتفاق یہ قرارداد منظور ہوئی۔

عربی و فارسی نصاب کمیٹی کے اراکین میں علامہ شبلی نعمانی، مولانا حمید الدین فراہی، مولوی محمد اسلم جیراج پوری (۲۶) اور بانی مدرسہ مولانا محمد شفیع صاحب کے نام درج ہیں۔ مولانا محمد شفیع خاں نے ان ناموں کو پیش کیا اور حاجی صدر علی نے اس کی تائید کی۔

اسی سال ۲۹؍اکتوبر ۱۹۱۱ء کو مجلس منتظمہ کی دوبارہ کارروائی ہوئی۔ اس میں اراکین نے مجلس تعلیم عربی کا انتخاب کیا۔ ان بزرگوں کے اسمائے گرامی اور ان کی ذمہ داریوں کی تفصیل اس سال کی روداد میں اس طرح درج ہے:

''مولوی محمود حسن صاحب دیوبندی (۲۷)، اگر وہ نہ منظور کریں تو مولوی اشرف علی صاحب (۲۸)[مولوی عبدالغنی صاحب اس کے متعلق خط و کتابت

کریں]، مولوی حمید الدین صاحب، مولوی محمد شبلی صاحب نعمانی مولوی محمد اسلم جیراج پوری، مولوی حفیظ اللہ بندی (۲۹)، مولوی محمد کامل صاحب نونیہ ڈیہہ (۳۰)، مولوی محمد عمر صاحب بندوی (۳۲)، مولوی واجد علی صاحب دونوی (۳۳)، مولوی مرزا محمد سلیم صاحب وکیل (۳۴)، مولوی مرزا محمد نعیم صاحب وکیل، مولوی محمد شفیع صاحب سکریٹری مجلس تعلیم۔ اس سلسلہ میں یہ صراحت بھی ہے کہ امور تعلیمی میں ان کے سوا کسی کو کوئی اختیار نہ ہوگا۔''

اس اجلاس میں انگریزی تعلیم کی مجلس کا بھی انتخاب عمل میں آیا۔ اس کی روداد کے آخر میں علامہ شبلی کا حسب ذیل نوٹ مع دستخط موجود ہے:

''یہ کاغذ تکمیل کے بعد چھپوا کر مع دستور العمل مرتبہ مولوی حمید الدین تمام ارکان اور دیگر اشخاص کے نام کثرت سے شائع کیا جائے۔

شبلی

۳۱؍اکتوبر ۱۹۱۱ء

اس زمانہ میں اراکین اور اساتذہ مدرسہ کے درمیان مولوی فیض الحسن (۳۵) کو لے کر کچھ اختلافات پیدا ہوئے، اس کے حل کرنے میں بھی علامہ شبلی نے بھی دلچسپی لی۔ مولوی مرزا محمد سلیم صاحب وکیل (۳۶) کے نام علامہ شبلی نے ایک خط میں اس کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ

جناب من! تسلیم

سرائے میر کے مدرسہ میں کچھ اختلافات پیدا ہو گئے ہیں اس لئے

بموجب

سرچشمہ شاید گرفتن بہ میل

فوراً تلافی کرنی چاہئے۔ کل اتوار ہے، میں بھی موجود ہوں۔ دس بجے کی گاڑی میں آجایئے تو مشورہ ہو کر سب باتیں طے کر دی جائیں۔

شبلی نعمانی (۳۷)

اس خط پر تاریخ درج نہیں ہے، اس لئے قطعی تاریخ طے نہیں کی جا سکتی۔ البتہ بعض دوسری تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۱۹۱۲ء کا واقعہ ہے۔ (۳۸)

۲۶، ۲۷ر دسمبر ۱۹۱۳ء کو مدرسۃ الاصلاح کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا۔ اس میں مدرسہ کے پچاس سے زاید اراکین و عمائدین اور سرپرست شریک ہوئے۔ ان میں علامہ شبلی نعمانی، مولانا حفیظ اللہ بندی کلاں، مولوی ابراہیم صاحب بنارسی (۳۹) اور مولوی عبداللطیف صاحب رامپوری (۴۰) کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس جلسہ میں مولانا حفیظ اللہ صاحب نے عربی تعلیم کے موضوع پر تقریر کی۔ مولانا عبداللطیف رام پوری نے تعمیر مسجد کے موضوع پر تقریر کی، جس کا فوری یہ اثر ہوا کہ حاضرین نے تعمیر مسجد کے لئے ایک رقم پیش کر دی۔ مولانا ابراہیم بنارسی اور بعض طلبہ نے بھی اس موقع پر تقریریں کیں اور جلسہ بڑی کامیابی کے ساتھ اختتام کو پہنچا۔ اس سالانہ جلسہ کے تمام اخراجات علامہ شبلی کے چھوٹے بھائی مولوی محمد اسحاق (۴۱) وکیل ہائی کورٹ الہ آباد نے اپنی جیب خاص سے ادا کئے۔ (۴۲)

اراکین مدرسۃ الاصلاح نے علامہ شبلی سے خواہش ظاہر کی تھی کہ تقسیم اختیارات کی توضیح فرما دیں۔ چنانچہ علامہ شبلی نے تقسیم اختیارات کے متعلق روداد میں درج ذیل تحریر اپنے قلم سے تحریر فرمائی ہے۔ علامہ شبلی کی یہ غیر مطبوعہ تحریر روداد میں محفوظ ہے اور پہلی بار منظر عام پر لائی جا رہی ہے:

توضیح تقسیم اختیارات معتمد مدرسہ اصلاح المسلمین سرائے میر

چونکہ معتمد صاحب کے اختیارات کے متعلق ارکان اور دگر اشخاص کو بعض امور میں اشتباہ واقع ہوتا ہے اور چونکہ اکثر ارکان نے مجھ سے خواہش ظاہر کی کہ میں اس کی تشریح و توضیح کر دوں، اس لئے میں نے ناظم صاحب مدرسہ اور معتمد صاحب مدرسہ اور دیگر ارکان سے گفتگو اور مشورہ کر کے حسب ذیل امور قرار دیئے ہیں:

۱۔ جیسا کہ دستور العمل مرتبہ مولوی حمید الدین صاحب میں لکھا ہے

معتمد مدرسہ کا اصلی فرض سفارت کی ترتیب ہے۔ اور اس بنا پر وہ حسب ذیل طریقے سے کام کریں گیں:

۲۔ وقتاً فوقتاً سفرا کو بغرض تحصیل چندہ یا وعظ و ہدایت اطراف و دیہات میں بھیجیں گے۔

۳۔ خود بھی وقتاً فوقتاً جہاں مناسب سمجھیں دورہ کریں گے۔

۴۔ جس گاؤں میں چندہ وصول کیا جائے گا، چندہ دینے والوں کو فرداً فرداً یا مجموعی رقم کسی شخص کے پاس جمع ہوکر اسکو مجموعی رقم کی رسید دیں گے یا اس کو ہدایت کریں گے کہ وہ خود براہ راست ناظم صاحب مدرسہ کے پاس رقم مجتمعہ بھیج دے۔

۵۔ سفراء بھی اسی طریقہ کے مطابق عمل کریں گے۔

۶۔ جو رقم آتی جائے گی وہ ناظم صاحب کے پاس جمع ہوتی جائے گی اور ان سے رسید یا دستخط حاصل کی............

۷۔ ہر مہینہ کے آخر میں ایک نقشہ حسب ذیل مرتب کر کے ناظم صاحب کے دستخط سے میرے پاس بھیج دیا کریں گے۔

[۱] مہینہ اور تاریخ [۲] سفراء مع تصریح نام وحالت [۳] مقامات دورہ [۴] زر چندہ [۵] حوالگی۔

شبلی

۲رنومبر (غالباً) ۱۹۱۱ء

۱۹۱۳ء میں بعض علمائے ندوہ بالخصوص مولانا خلیل الرحمٰن سہارن پوری (۴۳) کی روز روز کی ریشہ دوانیوں سے تنگ آ کر علامہ شبلی نے ندوہ کی معتمدی سے استعفیٰ دے دیا اور اپنے وطن اعظم گڑھ چلے آئے۔ اس موقع پر حافظ نور محمد صاحب موضع طویٰ (۴۴) کی صدارت میں مدرسہ اصلاح المسلمین سرائے میر کی انتظامیہ کا ایک اجلاس منعقد ہوا، جس کے ایجنڈے میں محض ایک

قرارداد ہے کہ مولانا حمید الدین فراہی نے مدرسہ کی نظامت ترک کر کے علامہ شبلی کے حوالہ کرنے کی پیش کش کی ہے، مگر روداد میں یہ بھی درج ہے کہ علامہ شبلی نے ضعف اور پیری کے سبب یہ منصب قبول نہیں کیا۔ چنانچہ مجلس منتظمہ میں یہ فیصلہ ہوا کہ

''موجودہ ممبران نے اپنی رضامندی ظاہر کی ہے کہ آئندہ اتوار ۴؍اکتوبر ۱۹۱۴ء بوقت ۸؍ بجے دن بخدمت جناب مولانا موصوف حاضر ہوں اور انہیں راضی کیا جائے۔'' (۴۵)

چنانچہ ۴؍اکتوبر ۱۹۱۴ء کو شبلی منزل شہر اعظم گڑھ میں بانی مدرسہ مولوی محمد شفیع خاں صاحب کی صدارت میں مجلس انتظامیہ کا جلسہ منعقد ہوا اور متعدد امور کا فیصلہ ہوا۔ اس کی تفصیل روداد میں درج ہے۔ نظامت کے سلسلہ میں یہ فیصلہ ہوا کہ سردست نائب ناظم مولوی محمد شفیع خاں صاحب نظامت کا کام بھی انجام دیتے رہیں گے۔

اس جلسہ انتظامیہ کے سوا مولانا فراہی نے علامہ شبلی سے ایک خط کے ذریعہ بار نظامت اٹھانے کی پیش کش کی۔ چنانچہ اس کے جواب میں علامہ شبلی نے لکھا کہ

''بھائی! بایں ضعف و دل شکستگی مدرسہ سرائے میر کی نظامت کیونکر کر سکتا ہوں؟ کوئی دسرا شخص سوچو۔ امکانی مدد کرتا رہوں گا۔'' (۴۶)

گذشتہ میٹنگ کے اس جلسہ کے محض ڈیڑھ ماہ بعد ۱۸؍نومبر ۱۹۱۴ء کو علامہ شبلی نعمانی کا سانحہ وفات پیش آیا تو ۲۰؍نومبر ۱۹۱۴ء کو حاجی حسن علی خاں صاحب موضع رواں (۴۷) کی صدارت میں مدرسۃ الاصلاح کی انتظامیہ کا جلسہ منعقد ہوا اور علامہ مرحوم کے حسب الحکم باتفاق رائے مولوی شبلی صاحب ندوی (۴۸) کو اعزازی مدرس عربی منظور کیا گیا۔

اسی طرح انتظامیہ کا ایک جلسہ ۱۰؍جون ۱۹۱۵ء کو صوفی عبد المجید خاں صاحب (۴۹) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ جس میں علامہ شبلی مرحوم کی خواہش کے مطابق درج ذیل فیصلے ہوئے:

۱۔ مولوی مسعود علی ندوی صاحب حسب تجویز مولانا مرحوم نائب ناظم مقرر کئے جائیں۔

۲۔ مولانا شبلی صاحب ندوی (بمہوری) صدر پرنسپل مقرر کئے جائیں اور فرائض و

اختیارات صدران کوتفویض کئے جائیں۔ مدرسین واتالیق وناظر مطبخ وطلبا براہ راست صدر کے ماتحت ہوں گے۔(۵۰)

اس کے بعد فروری ۱۹۱۶ء میں مجلس انتظامیہ کے جلسہ میں علامہ مرحوم کے عہدہ پر مولوی ماجد علی صاحب (۵۱) کا انتخاب عمل میں آیا۔(۵۲)

مدرسۃ الاصلاح کے حوالہ سے علامہ شبلی کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ اپنے تلامذہ بالخصوص علامہ حمید الدین فراہی، مولوی مسعود علی ندوی اور مولانا شبلی متکلم ندوی وغیرہ کو اس کی طرف مسلسل متوجہ کرتے رہے۔۲۳/جون ۱۹۱۲ء کو مولانا فراہی مدرسۃ الاصلاح کے ناظم منتخب ہوئے۔ یہ انتخاب علامہ شبلی ہی کی تحریک وتجویز پر عمل میں آیا تھا۔(۵۳)

۱۹۱۰ء میں علامہ حمید الدین فراہی[۱۸۶۴-۱۹۳۰ء] نے مدرسۃ الاصلاح کا جو نصاب تعلیم تیار کیا تھا، جیسا کہ اوپر گذرا اس میں بھی علامہ شبلی کا نہ صرف مشورہ شامل تھا بلکہ ان ہی کی نظر ثانی کے بعد وہ شائع ہوا اور عمل میں آیا۔مشہور عالم دین، صاحب تفسیر تدبر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی[۱۹۰۴-۱۹۹۷ء](۵۴) نے سچ لکھا ہے کہ

> ''ان دونوں بزرگوں (علامہ شبلی وفراہی) کو اس مدرسہ سے ابتدائے قیام ہی سے نہایت گہرا تعلق رہا ہے۔اس قالب میں تخیل اور نصب العین کی روح انہی بزرگوں کی پھونکی ہوئی ہے۔''(۵۵)

علامہ شبلی کی خدمات مدرسۃ الاصلاح کے بارہ میں سابق ناظم مولانا بدرالدین اصلاحی [۱۹۰۴-۱۹۹۶ء] نے لکھا ہے کہ

> ''شبلی جب ندوہ سے ترک تعلق کر کے اعظم گڑھ آگئے اور دارالمصنّفین قائم کرنے کی تدبیریں شروع کیں تو مولوی محمد شفیع صاحب نے ان کو مشورے اور رہنمائی کے لئے بلایا۔شبلی نے آکر مدرسے کو دیکھا اور اطمینان کا اظہار کیا۔ جب تک وہ زندہ رہے اس کی اصلاح اور ترقی کی تدبیریں سوچتے رہے۔ انہوں نے آکر مدرسے کے نظم ونسق کو درست کیا۔ان کے مشوروں سے

اساتذہ کا تقرر ہوااور باقاعدگی کے ساتھ پڑھائی ہونے لگی۔ناظم اور مہتمم وغیرہ کے عہدے انہیں کے زمانے میں قائم ہوئے۔''(۵۶)

۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۴ء تک کا دورانیہ علامہ شبلی کی زندگی کا بظاہر تالیف سیرۃ النبیؐ اور قیام دارالمصنّفین کے سبب،جس قدر خوبصورت معلوم ہوتا ہے علامہ شبلی کی سیرت وشخصیت پر ندوہ کے بعض علماء کے بے بنیاد اور رکیک الزامات اور پھر ندوہ سے ان کی علاحدگی کے سبب اسی قدر تکلیف دہ اور دل آزار بھی ہے۔نامساعد حالات سے جس طرح وہ نبرد آزما ہوئے ان کا ذکر مکاتیب شبلی کے صفحات میں موجود ہے۔بڑی بات یہ ہے کہ انہیں جن مسائل اور مشکلات کا سامنا ہوتا انہیں وہ اپنے ماموں زاد بھائی علامہ حمید الدین فراہی کو کبھی کبھی لکھ دیا کرتے تھے۔جس سے مدرسۃ الاصلاح کی مجلس انتظامیہ کے ارکان بھی واقف تھے۔یہی وجہ ہے کہ انہیں ایک سے زاید بار علامہ فراہی اور انتظامیہ مدرسۃ الاصلاح کی طرف سے نظامت کی پیش کش کی گئی اور اگر آپ مدرسۃ الاصلاح کی مجلس انتظامی کی کارروائی غور سے دیکھیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ارکان انتظامی علامہ شبلی کی دلجوئی کررہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جن تخیلات کی تکمیل وہ ندوۃ العلماء میں کرنا چاہتے تھے وہ مدرسۃ الاصلاح پر انجام دیں یا جن امور کی انجام دہی میں ندوہ میں رخنے ڈالے گئے اسے علامہ یہاں پایۂ تکمیل کو پہنچائیں۔چنانچہ ان کے نظریہ تعلیم کے مطابق نصاب تعلیم تیار ہوا تو وہ اس میں اصلاح وترمیم کرتے ہیں۔اسے زیادہ سے زیادہ طبع کرا کے علاقہ میں تقسیم کرانے کا مشورہ دیتے ہیں۔وہ نیشنل اسکول اعظم گڑھ، دارالمصنّفین اور مدرسۃ الاصلاح کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو انہیں 'جامعہ اسلامیہ' بنانا چاہتے ہیں،لیکن اب علامہ شبلی کی زندگی کی شام ہوچکی تھی۔قویٰ جواب دے رہے تھے۔باوجود اس کے سیرۃ النبیؐ اور دارالمصنّفین کی تاسیس جیسے عظیم الشان علمی کام بھی جاری تھے۔اس لئے ممکن ہے انہوں نے اس دلچسپی کا اظہار نہ کیا ہو،جس کا اظہار ایسے مواقع پر وہ عموماً کیا کرتے تھے۔اس کے باوجود مدرسۃ الاصلاح کی مجلس انتظامی نے ان کے تمام مجوزہ خاکوں،ارادوں اور خواہشوں کو بغیر کسی شور وشغب کے خوش دلی سے منظور کرلیا۔چنانچہ مولانا شبلی متکلم ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی،(۵۷) دونوں مدرسۃ الاصلاح سے وابستہ ہوئے۔علامہ شبلی

کی ''انجمن خدام الدین'' کے رکن اساسی مولانا عبدالرحمٰن نگرامی (۵۸) نے بھی یہیں زندگی بسر کرنے کا ارادہ کیا۔ ان کے علاوہ بھی بعض تلامذہ شبلی جوان کی تعلیم کے نمونہ تھے، یہاں استاذ مقرر ہوئے۔ بعدازاں علامہ حمید الدین فراہی کی وابستگی نے تو اسے ہندوستان گیر شہرت دلادی۔ نامور درسگاہوں اور مطالعہ قرآن کے اہم مراکز میں شامل کردیا۔ صاحب ''نظام القرآن'' علامہ حمیدالدین فراہی کی تحقیقات قرآنی کے سوا مولانا امین احسن اصلاحی کی ''تدبر قرآن''، مولانا بدرالدین اصلاحی کی ''مباحث القرآن''، (۵۹)، سابق امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابواللیث اصلاحی (۶۰) اور مولانا صدرالدین اصلاحی (۶۱) کے قرآنی مقالات اسی فکرونظر کی بدولت وجود میں آئے۔ الحمدللہ وقتاً فوقتاً اس سلسلہ کی کتابیں اب بھی شائع ہوتی رہتی ہیں۔ حال میں دائرہ حمیدیہ نے علامہ فراہی کے قرآنی حواشی کو جس اہتمام سے شائع کیا ہے وہ دراصل اسی سلسلہ تحقیقات قرآنی کی تدوین ہے۔

قرآن اور علوم القرآن میں غواصی کا سلسلہ علامہ فراہی اگرچہ مدرسۃ الاصلاح میں اپنے قیام سے پہلے کرچکے تھے، تاہم اس کا بڑا حصہ انہوں نے اسی کی فضائے بسیط میں قلم بند کیا۔ تعجب ہوتا ہے کہ ان کی مثالی خاموش طبعی کے باوجود ان کی قرآنی فکر نے چاردانگ عالم کو مسخر کیا اور آج بھی یہ شمع فروزاں ہے اور وابستگان مدرسۃ الاصلاح اسے حرز جاں بنائے ہوئے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ جسے ہر حلقہ کا امتیاز ہونا تھا وہ محض مدرسۃ الاصلاح کا امتیاز بن کررہ گیا۔

علامہ فراہی کی وفات کے بعد ان کی یاد میں دائرہ حمیدیہ قائم ہوا اور مولانا امین احسن اصلاحی کی ادارت میں ماہنامہ الاصلاح جاری ہوا۔ اس میں بھی روح شبلی موجزن رہی۔ علاوہ ازیں ماہنامہ الاصلاح میں علامہ اقبال احمد خاں سہیل [۱۸۸۴-۱۹۵۵ء] کی ''سیرت شبلی'' (۶۲) کی مسلسل اشاعت دراصل اپنے بزرگ کی یاد تازہ کرنے ہی کے لئے تھی۔ یہی نہیں جب علامہ شبلی وفراہی کے بعض خیالات کی غلط توضیح وتفہیم پر ملک کے ایک حلقے کی طرف سے بے جا تکفیر کا شوروغوغا بلند ہوا تو اسی مدرسۃ الاصلاح اور ماہنامہ الاصلاح نے اس زہر کا تریاق بھی فراہم کیا۔ علامہ شبلی وفراہی کے تلامذہ بالخصوص مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا امین احسن اصلاحی وغیرہ نے ان

کے جوابات لکھے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی[۱۹۰۳-۱۹۷۹ء] نے بھی اس موضوع پر ماہنامہ ترجمان القرآن میں قلم اٹھایا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اس کے خلاف ایک طویل اور مدلل مقالہ 'علامہ شبلی وفراہی کے خلاف غوغائے تکفیر' کے عنوان سے لکھا جو اسی ماہنامہ الاصلاح [۰۰؟] میں شائع ہوا۔ یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ علامہ شبلی کی تکفیر کے جوابات فضلائے مدرسۃ الاصلاح نے جس حقیقت پسندانہ اور والہانہ انداز میں لکھے، اس نے ثابت کر دیا ہے کہ علامہ شبلی کی شخصیت اور فکر پر بیجا ایک حرف بھی ناقابل تسلیم تصور کرتے تھے۔ تعجب ہے کہ علامہ شبلی کے لئے جس کو سب سے اول میدان میں آنا چاہئے تھا یعنی فضلائے ندوۃ العلماء انہوں نے چشم پوشی برتی۔ اور سوائے جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی کے اور کسی ندوی فاضل کی تحریر اس موضوع پر میری نظر سے نہیں گذری۔

یہاں ایک اور بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ مدرسۃ الاصلاح کے نصاب تعلیم میں افادیت کے پیش نظر جب انگریزی شامل کی گئی تو بعض تنگ نظر مدرسہ کے مالی تعاون کی راہ میں دشواریاں پیدا کرنے لگے۔ حتیٰ کہ بعض ارکان نے اسے نصاب سے خارج کرنے کی قرارداد پیش کی اور بعضوں نے شدید مخالفت کی، مگر مدرسۃ الاصلاح کی تاریخ گواہ ہے کہ تمام دقتوں اور دشواریوں اور ناگواریوں کے باوجود اس نصاب تعلیم سے جو شبلی وفراہی کے نظریات پر مشتمل تھا ہٹنا گوارا نہیں کیا۔ یہ دراصل مجلس منتظمہ کی ملی مفاد کے تئیں وفاداری اور اپنے بزرگوں سے بے پناہ عقیدت کا مظہر ہے۔

اس سے پہلے علامہ شبلی ندوہ میں انگریزی کی شمولیت کے لئے جدوجہد کر چکے تھے۔ انہیں وہاں بھی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ندوہ میں علامہ شبلی کی فہرست جرائم میں ایک جرم انگریزی سے ان کی محبت بھی تھی۔ اور جب وہ اسی ندوہ سے علاحدہ ہو گئے اور پھر چند ماہ بعد سفر آخرت اختیار کیا تو وہی انگریزی پاک وصاف ہوگئی۔

ہمارے ایک بزرگ اور صاحب تصوف وسلوک جو اسی خطہ سرائے میر کی شان تصور کئے جاتے تھے اور جنہیں ابتداء میں مدرسۃ الاصلاح سے تعلق خاطر بھی تھا۔ ایک زمانہ میں وہ علامہ شبلی

وفراہی کے نظریات پر سخت چوٹیں اور اپنے جلسوں میں ان کی تکفیر کا برملا اظہار کیا کرتے تھے، تاہم علما وفضلائے مدرستہ الاصلاح نے انتہائی صبر وتحمل سے کام لیا اور کبھی غلاظت کو غلاظت سے صاف کرنے کی کوشش نہیں کی اور وہی کیا جو ان کے قابل تقلید بزرگ علامہ شبلی کا طرز عمل تھا، یعنی کسی کا جواب دینے سے بہتر ہے کہ اس دوران کوئی دوسرا اچھا سا کام کرلیا جائے۔

علامہ شبلی نے قدیم صالح اور جدید نافع کے جس نظریہ کو علماء ودانشوروں کے سامنے پیش کیا تھا اور ندوہ میں جس کے نفاذ کے لئے انہوں نے اپنی سب صلاحیتیں صرف کر دی تھیں، وہ نظریہ تعلیم مدرستہ الاصلاح میں نافذ ہوا اور اس کے اچھے نتائج سامنے آئے۔ آج ایک صدی بعد جب ہم بنظر غائر جائزہ لیتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ندوۃ العلماء کے فضلا کے بالمقابل کم تعداد میں ہونے کے باوجود فضلائے مدرستہ الاصلاح نے فکر شبلی وفراہی کی تفہیم وترویج اور اشاعت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ البتہ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ علامہ فراہی کے بالمقابل علامہ شبلی سے فضلائے مدرستہ الاصلاح کی نسبت ذرا کم کم ہی محسوس ہوتی ہے، حالانکہ وہ ان کے ممدوح اور کمالات علمی کے اعتراف میں غالباً سب سے بلند اور ممتاز مقام پر فائز ہیں۔

تعلیقات و حواشی:

(۱) مولانا محمد شفیع خاںؒ [۱۸۶۶-۱۹۴۵ء] موضع سیدھا سلطان پور کے رہنے والے ایک نیک دل اور خدارسیدہ بزرگ عالم دین تھے۔ ان کی تعلیم وتربیت داناپور بہار میں ہوئی تھی، جہاں ان کے چچا حافظ قادر بخش صاحب استاذ تھے۔ وہاں انہوں نے حفظ قرآن کے بعد دینی علوم قرآن حدیث اور فقہ کی تحصیل کی۔ کچھ دنوں تک وہیں درس وتدریس سے وابستہ رہے۔ بعد ازاں اعظم گڑھ واپس آئے اور بقیہ زندگی خطہ اعظم گڑھ میں اسلام اور اسلامی علوم وفنون کے فروغ واشاعت میں لگا دی۔ ان کا ایک کارنامہ اصلاح معاشرہ کے لئے جدو جہد ہے۔ وہ دور دراز سے علماء ومشائخ کو تبلیغ و اشاعت کے لئے مدعو کرتے اور اور گاؤں گاؤں میں دینی جلسوں کا اہتمام کرتے۔ مدرستہ الاصلاح کا قیام ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

ان کے صاحبزادوں میں سوائے ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی [۱۹۲۷-۱۹۷۸ء] استاذ شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سب نے دینی تعلیم حاصل کی اور تاحیات اسی کی خدمت سے وابستہ رہے۔ مولانا عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی [۱۹۲۰-۱۹۸۴ء] کا مصنف کی حیثیت سے درجہ مسلم ہے۔ انہوں نے شیخ مخدوم علی مہائمی: احوال وآثار، مولانا صدرالدین آزردہ احوال وآثار اور شاہ وجیہہ الدین علوی گجراتی: احوال وآثار جیسی بلند پایہ اور معرکہ آرا سوانح عمریاں سپرد قلم کیں۔ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹیوٹ ممبئی سے اس کے ڈائرکٹر پروفیسر عبدالستار دلوی کے اہتمام میں ان کے دوسرے ایڈیشن بھی شائع ہوئے ہیں۔ نامور شخصیات پر ان کے مضامین کا ایک مجموعہ ''علم و ہدایت کے چراغ'' بھی ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا ہے۔

(۲) مولانا محمد شفیع خاں کا پہلا کارنامہ انجمن اصلاح المسلمین کا قیام ہے جو انہوں نے ضلع اعظم گڑھ کے قصبات ومواضعات میں آباد مسلمانوں کی اصلاح وتربیت کے لئے قائم کی تھی۔ چنانچہ متعدد گاؤں میں اس کی شاخیں قائم ہوئیں۔ مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے ان قصبات ومواضعات کی فہرست اپنی کتاب ''تذکرہ علمائے اعظم گڑھ'' میں درج کی ہے۔ (ص ۳۴۵) یہی تنظیم مدرسۃ الاصلاح کے قیام کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

انجمن اصلاح المسلمین ۱۹۰۴ء میں قائم ہوئی، لیکن مولانا سید سلیمان ندوی نے ''حیات شبلی'' میں اس کا سنہ تاسیس ۱۹۰۸ء لکھا ہے (حیات شبلی ص ۶۲۹)، مگر یہ سنہ درست نہیں ہے۔

(۳) تذکرہ علمائے اعظم گڑھ طبع جدید۔ ص ۳۵۱

(۴) ذکر فراہی ص ۳۴۸

(۵) علامہ شبلی کے والد شیخ حبیب اللہ وکیل [۱۲ر نومبر ۱۹۰۰ء] اعظم گڑھ کے بڑے بااثر اور ممتاز اشخاص میں سے تھے۔ نہ صرف نامور وکیل، ماہر قانون داں بلکہ بڑے زمیندار تھے۔ شعر و ادب کا ذوق بھی بہت پختہ تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ علامہ شبلی نے ان کے مذاق شعروادب کا واقعہ شعرالعجم میں نقل کیا ہے۔ رفاہ عام کے کاموں میں بڑھ کر حصہ لیتے۔ اعظم گڑھ میونسپلٹی کے برسوں اعزازی عہدہ دار رہے۔ شہر اعظم گڑھ کو سیلاب سے محفوظ رکھنے کے لئے

شہراوردریا کے درمیان پہلا بند انہیں نے تعمیر کرایا تھا۔سرسید سے ان کے خاص مراسم وتعلقات تھے۔ ان سے ملاقات کے لئے غازی پور اور علی گڑھ کے سفر کا ذکر ملتا ہے۔انہوں نے مختلف مواقع پر ایم اے او کالج علی گڑھ کا مالی تعاون بھی کیا۔سرسید نے انہیں اپنی پیٹریاٹک سوسائٹی کا اعظم گڑھ کا کرسپانڈنگ رکن بھی نامزد کیا تھا۔

تعلیم سے خاص دلچسپی تھی۔نیشنل اسکول کے پہلے صدر کے عہدہ پر وہ مدۃ العمر فائز رہے۔ اپنے بچوں کواعلی تعلیم دلائی۔ بڑے بیٹے علامہ شبلی کا شمار دنیا کے نامور علماء،ادباءاورانشاپردازوں میں ہوتا ہے۔دوسرے صاحبزادے حافظ محمد مہدی حسن اعظم گڑھ کے پہلے بیرسٹرایٹ لا تھے۔تیسرے صاحبزادے مسٹرمحمد اسحاق الہ آباد ہائی کورٹ کے نامور وکیل اور چوتھے بیٹے محمد جنید نعمانی کان پور میں جج کے عہدہ پر متمکن ہوئے۔غرض ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است''

(۶) الٰہی شاہ: یہ بزرگ مولوی محمد کامل ولید پوری کے مرید وخلیفہ تھے۔موضع صبرحد ضلع جون پور کے رہنے والے تھے۔حیات شبلی ص ۱۲۵

(۷) حیات شبلی ص ۵۵۸

(۸) سرسید کا یہ خطبہ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ جنوری ۲۰۲۰ء میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

(۹) قد اور سائے۔ص ۱۶-۳۳

(۱۰) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۵/اکتوبر ۱۸۸۱ء

(۱۱) حیات شبلی ص ۱۸۴

(۱۲) تذکرہ علمائے اعظم گڑھ ص ۳۴۹

(۱۳) حیات شبلی ص ۶۳۰

(۱۴) ماہنامہ معارف نومبر ۲۰۲۱ء ص ۳۷۷

(۱۵) تذکرہ علمائے اعظم گڑھ ص ۳۴۵

(۱۶) تذکرہ علمائے اعظم گڑھ۔ص ۳۵۰،طبع جدید

(۱۷) مکاتیب شبلی ج ۲،ص ۳۰

(۱۸) خدام الدین: علامہ شبلی مدۃ العمر مستشرقین اور مخالفین اسلام سے نبرد آزمار ہے۔اخیر زندگی میں آریوں کی اسلام مخالف سرگرمیوں کے تدارک کے لئے انہوں نے متعدد کوششیں کیں، ان میں ایک کوشش تنظیم خدام الدین کا قیام بھی ہے۔ان کا خیال تھا کہ ''جب تک مبلغین اسلام کی ایک ایسی جماعت نہ تیار کی جائے جو مذہبی تعلیم کے ساتھ سادہ مذہبی زندگی بسر کرے، اس میں ایثار، قناعت اور جفاکشی کا مادہ ہو، اس وقت تک آریوں کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ (حیات شبلی ص ۵۴۰)

اس مقصد کے لئے انہوں نے ندوہ میں طلبہ کی ایک جماعت کی بنیاد ڈالی اور اس کا نام خدام الدین رکھا، اس کے لئے جو طلبہ تیار ہوئے ان کے والدین سے اس کام کے لئے ان کی رضامندی منگوائی اور ان کو اس جماعت یعنی خدام الدین میں داخل کیا۔اس میں سات طلبہ شامل ہوئے تھے، جن میں ایک مولانا عبدالرحمٰن نگرامی بھی تھے۔انہوں نے اگرچہ بہت کم عمر پائی، تاہم وہ تاحیات اس عہد و پیمان پر کاربند رہے۔ندوہ کے بعد یہ کام انہوں نے مدرسۃ الاصلاح سرائے میں بھی پیش نظر رکھا اور اس کے لئے کوشش کی۔یہاں سادہ زندگی کا تصور دراصل اسی تنظیم کے مرہون منت قائم ہوا۔

(۱۹) مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۱۴۱

(۲۰) مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۱۳۵

(۲۱) مولوی مرزا محمد نعیم وکیل: مولوی مرزا محمد سلیم وکیل موضع مسلم پٹی کے بھائی تھے۔اعظم گڑھ کچہری میں وکالت کرتے تھے۔دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، مسلم ایجوکیشن سوسائٹی علی گڑھ اور مدرسۃ الاصلاح کی مجلس انتظامیہ کے رکن رہے۔دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کے لئے جو زمینیں وقف ہوئی ہیں ان میں ان کا حصہ بھی شامل ہے۔

(۲۲) شاہ محمد اسحاق صاحب: مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اور شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ کی مجلس انتظامیہ کے رکن تھے۔اور ان کی تعمیر و ترقی میں سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔

(۲۳) مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے سابق ناظم حاجی رشیدالدین انصاری[م:۱۹۵۹ء] ترجمان القرآن علامہ حمیدالدین فراہی کے چھوٹے اور علامہ شبلی کے ماموں زاد بھائی تھے۔قومی و ملی معاملات سے دلچسپی رکھتے اور ان میں آگے بڑھ کر حصہ لیتے ۔مدرسۃ الاصلاح سے کی تعمیر و ترقی

میں ان کا قابل ذکر حصہ ہے۔علامہ حمید الدین فراہی کی وفات کے بعد ان کے جانشین اور ناظم منتخب ہوئے۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ پر جن لوگوں کی زمینیں وقف ہیں، ان میں ایک اہم نام حاجی رشید الدین کا شامل ہے۔ وہ علامہ شبلی سے بہت قریب رہے۔ وقف نامہ میں ان کا تعاون بھی شامل حال رہا۔علامہ شبلی کی وفات کے بعد انہی کی کوششوں سے وقف کا کام جلد ممکن ہوسکا۔ چنانچہ وقف کے کاغذات سید صاحب کے حوالہ کر کے اطمینان کا سانس لیا۔سید صاحب نے انہیں دارالمصنّفین کی مجلس انتظامیہ کا رکن نامزد کیا، جس پر مدۃ العمر فائز رہے اور اس کی تعمیر و ترقی میں اپنا حق ادا کرتے رہے۔۱۹۵۹ء میں وفات پائی۔ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، نومبر ۱۹۵۹ء، ص ۳۲۲

(۲۴) روداد مجلس انتظامیہ مدرسۃ الاصلاح ۳۰/اکتوبر ۱۹۱۰ء

(۲۵) محمد خلیل خاں صاحب: رکن مجلس انتظامیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، ان کی صدارت میں مجلس انتظامیہ مدرسۃ الاصلاح کا کم از کم ایک جلسہ منعقد ہوا۔

(۲۶) حاجی صدر علی صاحب: مجلس انتظامیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے رکن تھے۔ نصاب تعلیم کمیٹی بھی یہ رکن نامزد ہوئے تھے۔

(۲۷) مولانا محمد اسلم جیراج پوری[۱۸۸۲-۱۹۵۵ء] نامور عالم و مصنف اور جامعہ ملیہ کے استاذ تھے۔ ان کے قلم سے متعدد کتابیں نکل کر مقبول ہو چکی ہیں، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے موضع جیراجپور کے رہنے والے اور مولانا سلامت اللہ جیراج پوری کے صاحبزادہ تھے۔ متعدد کتابیں لکھیں، ان میں تاریخ الامت بہت مشہور ہے۔ یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ جرجی زیدان کی تاریخ التمدن الاسلامی جس کا علامہ شبلی نے رد لکھا تھا، انہوں نے اس کے ایک حصہ کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔

مولانا بہت عمدہ شاعر تھے۔ان کے بعض اشعار اور مصرعے ضرب المثل ہو گئے ہیں۔

(۲۸) شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ[۱۸۵۱- ۱۹۲۰ء] ہندوستان کا وہ بطل جلیل جس نے مذہب وملت اور ملک کی آزادی کے لئے اپنا سب سرمایہ حیات قربان کر دیا اور آزادی کے لئے اس

وقت جدوجہد شروع کی جب کانگریس کا قیام بھی عمل میں نہیں آیا تھا۔ وہ مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے شاگرد رشید، بلند پایہ عالم دین اور دارالعلوم دیوبند کے صدرالمدرسین تھے۔ تحریک ریشمی رومال انہیں کے دم سے برپا ہوئی، جس میں علماء کی ایک بڑی جماعت شریک تھی۔ ہندوستان کی تحریک آزادی میں ان کا بڑا نمایاں حصہ ہے۔ عبوری حکومت کے قیام میں بھی ان کا بڑا اہم رول تھا۔ انہی سرگرمیوں کے سبب انگریزوں نے انہیں گرفتار کر کے مالٹا میں قید کیا، جہاں ان کی صحت بہت مجروح ہوئی اور پھر سنبھل نہ سکی۔ اور اسی بیماری میں ۳۰/نومبر ۱۹۲۰ء کو انہوں نے وفات پائی۔ انتظامیہ مدرسۃ الاصلاح نے انہیں مجلس تعلیم عربی کا رکن اس شرط پر منتخب کیا تھا کہ اگر وہ منظوری دیں۔ منظوری حاصل کرنے کے لئے مولانا عبدالغنی پھول پوریؒ کو منتخب کیا گیا تھا۔

(۲۹) مولانا اشرف علی تھانوی[۱۸۶۳-۱۹۴۳ء] حکیم الامت کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔

(۳۰) مولوی عبدالغنی پھول پوریؒ مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ ومجاز بیعت تھے۔

(۳۱) مولانا حفیظ اللہ بندی: موضع بندی کے رہنے والے نامور عالم ومدرس تھے۔ ایک مدت تک ندوہ کے مہتمم رہے۔ بعد میں اورینٹل کالج ڈھاکہ میں پرفیسر ہوگئے تھے۔ ان سے بے شمار تشنگان علوم وفنون نے اپنی علمی پیاس بجھائی۔

(۳۲) مولوی محمد کامل نونیہ ڈیہہ: رکن مجلس انتظامیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر

(۳۳) مولوی محمد عمر بندوی: رکن مجلس انتظامیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر

(۳۴) مولوی واجد علی دونوی: موضع دونا کے رہنے والے ممتاز عالم اور مدرسۃ الاصلاح کی مجلس انتظامیہ کے رکن تھے۔

(۳۵) مولوی مرزا محمد سلیم بیگ: موضع مسلم پٹی کے رہنے والے تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے۔ اعظم گڑھ میں وکالت کرتے تھے۔ مجلس انتظامیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے رکن اور علامہ شبلی کے بے تکلف احباب میں تھے۔ ۱۹/فروری ۱۹۲۳ء کو انتقال کیا۔

(۳۶) مولوی فیض الحسن: یہ بھی مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کی انتظامیہ کے رکن تھے۔ ۱۹۱۰ء کی مجلس انتظامیہ میں انہوں نے متعدد رزولیشن پیش کئے۔ بعد میں ان سے کوئی معاملہ یا تنازعہ ہوا، جس میں

وہ مدرسہ سے علاحدہ کئے گئے۔

(۳۷) مکتوبات شبلی ص ۹۳-۹۴

(۳۸) حیات شبلی۔ص ۶۳۱

(۳۹) مولوی ابراہیم بنارسی: تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔

(۴۰) مولوی عبداللطیف رامپوری: تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔

(۴۱) مولوی محمد اسحاق [۱۲/ اگست ۱۹۱۳ء] وکیل الہ آباد ہائی کورٹ علامہ شبلی کے منجھلے بھائی تھے۔ایم اے او کالج علی گڑھ سے تعلیم حاصل کی تھی۔۱۲/ اگست ۱۹۱۳ء کو چند دنوں کی بیماری میں انتقال کیا۔ علامہ شبلی انہیں اپنا دست و بازو خیال کرتے تھے۔ان کی وفات سے انہیں سخت صدمہ پہنچا۔علامہ شبلی نے ان کا بڑا دلدوز مرثیہ لکھا ہے جو ان کے کلیات میں شامل ہے۔مولوی محمد اسحاق صاحب کے ایک عزیز دوست مولوی محبوب الرحمٰن کلیم جیراج پوری [۱۸۶۸-۱۹۲۵ء] نے بھی ان کا ایک مرثیہ لکھا ہے۔

(۴۲) روداد جلسہ سالانہ مدرسۃ الاصلاح۔۱۹۱۳ء

(۴۳) مولوی خلیل الرحمٰن سہارن پوری [م: ۴/ فروری ۱۹۳۶ء] مولانا احمد علی محدث سہارن پوری کے صاحبزادے تھے۔دارالعلوم ندوہ کے پہلے نائب پھر ناظم ہوئے۔ یہ علامہ شبلی کے استاذ بھائی بھی تھے،مگر انہوں نے علامہ شبلی کی مخالفت کی گویا قسم کھا رکھی تھی۔ ہر معاملہ میں ان سے اختلاف کرتے اور جس قدر تکلیفیں پہنچا سکتے تھے ان میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے تھے۔انہوں نے علامہ شبلی کے ندوہ کے متعلق تمام کارناموں اور کاوشوں پر خاک پھیر دی۔ چونکہ ان کے ہم نوا بعض وہ علماء بھی تھے جنہیں بعد میں نظامت کا موقع ملا تو انہوں نے ان کے علم و فضل کا عمدہ مرقع پیش کیا اور قصداً علامہ شبلی کے کارناموں کو کم کر کے پیش کیا،جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علامہ شبلی کی عظیم الشان خدمات ندوہ سے بعد کی نسلیں واقف نہ ہوسکیں۔

(۴۴) مولوی نور محمد صاحب موضع طویٰ کے رہنے والے تھے۔ یہ بھی مجلس انتظامیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے رکن تھے۔

(۴۵)روداد مدرسۃ الاصلاح ۱۹۱۴ء

(۴۶) مکاتیب شبلی ج۲ ص۵۳

(۴۷) حاجی حسن علی صاحب :موضع رواں کے رہنے والے اور مجلس انتظامیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے رکن رہے۔

(۴۸) مولوی شبلی متکلم ندوی: علامہ شبلی کے شاگرداوران کی تعلیم وتدریس کے خاص واقف کار تھے۔علامہ نے انہیں وصیت کی تھی کہ جہاں رہو ہمارے نظریہ تعلیم کی اشاعت کرو۔

مولانا موضع بمہور کے رہنے والے تھے۔عرصہ تک مدرسۃ الاصلاح پر تدریسی خدمات انجام دیں۔اخیر میں لکھنؤ منتقل ہو گئے تھے وہیں وفات پائی۔

(۴۹) صوفی عبدالمجید خاں صاحب:رکن مجلس انتظامیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر

(۵۰) روداد جلسہ انتظامیہ مدرسۃ الاصلاح۔جون ۱۹۱۵ء

(۵۱) مولوی ماجد علی صاحب:مجلس انتظامیہ اور مجلس نصاب تعلیم مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے رکن تھے۔علامہ شبلی کی وفات کے بعد ان کی جگہ ان کا انتخاب عمل میں آیا تھا۔

(۵۲) روداد جلسہ انتظامیہ یکم فروری ۱۹۱۶ء

(۵۳) رجسٹر کارروائی انجمن مدرسۃ الاصلاح سرائے میر،غیر مطبوعہ

(۵۴) مولانا امین احسن اصلاحیؒ[۱۹۰۳-۱۹۹۷ء] مدرسۃ الاصلاح کے نامور فرزند اور صاحب تفسیر تدبر قرآن ہیں۔یہ دنیا بھر میں شہرت رکھتے ہیں۔موضع بمہور کے رہنے والے تھے۔دائرہ حمیدیہ قائم ہوا اور ماہنامہ الاصلاح جاری ہواتو انہیں نے اس کی ادارت کے فرائض انجام دئے۔ بعد میں ترک وطن کر کے پاکستان چلے گئے اور پھر وہیں کی خاک کا پیوند ہوئے۔ملاحظہ ہو مجلّہ علوم القرآن علی گڑھ کا مولانا امین احسن اصلاحی نمبر۔

(۵۵) ماہنامہ الاصلاح،اگست ۱۹۳۶ء ص۴

(۵۶) ذکر فراہی ص۲۵۵

(۵۷) مولوی مسعود علی ندوی[۱۸۸۹-۱۹۶۷ء] علامہ شبلی کے خاص شاگرد اور دارالمصنّفین کے

معماروں میں تھے۔ان کی انتظامی صلاحیتوں پر علامہ کو بڑا اعتماد تھا۔وہ بھیارہ ضلع بارہ بنکی میں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۹۰۴ء میں ندوہ آئے ۱۹۱۲ء میں تعلیم سے فراغت پائی۔مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی وغیرہ ان کے احباب میں تھے۔اس زمانہ میں ماہنامہ الندوہ کے جوائنٹ ایڈیٹر مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ان سے ربط وضبط قائم ہوا جو زندگی بھر استوار رہا۔علامہ شبلی سے انہیں بے پناہ عقیدت تھی۔ندوہ میں جب علامہ شبلی کے خلاف طوفان برپا ہوا اور علامہ شبلی ندوہ کی معتمدی سے مستعفی ہوئے اور طلبہ نے احتجاجاً اسٹرائک کردی،اس کی قیادت انہی مولوی مسعود علی ندوی نے کی تھی۔علامہ شبلی نے ۱۹۱۴ء میں اعظم گڑھ میں جب دارالمصنّفین قائم کیا تو انہیں اعظم گڑھ بلالیا۔اس کام کے لئے علامہ شبلی کا جو شاگرد سب سے پہلے اعظم گڑھ پہنچا وہ مولوی مسعود علی ندوی ہی تھے۔اور پھر آخری سانس تک وہ دارالمصنّفین سے وابستہ رہے۔یہیں ۲۷/اگست ۱۹۶۷ء کو وفات پائی۔میاں بیوی دونوں دارالمصنّفین کے احاطہ میں مدفون ہیں۔کئی برس تک مدرسۃ الاصلاح کی نظامت کے فرائض انجام دئے۔آخر میں دارالمصنّفین کے لئے یکسو ہو گئے تھے۔

(۵۸) مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی:قصبہ نگرام کے رہنے والے علامہ شبلی کے خاص شاگردوں میں تھے۔مدرسۃ الاصلاح پر استاذ رہے۔کم عمری میں انتقال کیا۔

(۵۹) مولانا بدرالدین اصلاحیؒ[۱۹۱۰-۱۹۹۶ء] مدرسۃ الاصلاح کے ممتاز فرزند تھے۔ان کے قرآنی مقالات کا مجموعہ''مباحث القرآن''مولانا عبدالرحمٰن ناصر اصلاحی [۱۹۱۶-۲۰۰۹ء] نے مرتب کرکے شائع کیا۔ان کی شخصیت پر مولانا ضیاءالدین اصلاحی کا بڑا عالمانہ مقالہ معارف میں شائع ہوا ہے۔

(۶۰) مولانا ابواللیث اصلاحیؒ[۱۹۱۳-۱۹۹۰ء] سابق امیر جماعت اسلامی ہند کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔وہ اعظم گڑھ کے ایک گاؤں چاند پٹی میں پیدا ہوئے۔مدرسۃ الاصلاح کے بعد ندوہ گئے اور ۱۹۳۳ء میں تکمیل کی۔اولاً مدینہ بجنور کی ادارت سے وابستہ ہوئے۔بعد ازاں اپنا رسالہ فاران جاری کیا۔اور کئی برس اس وادی میں نبرد آزما رہے۔۱۹۴۸ء میں جماعت اسلامی ہند کے امیر منتخب ہوئے اور ایک وقفہ کے سوا تا حیات امارت کا فریضہ انجام دیا۔مزید تفصیل کے لئے دیکھیں: ماہنامہ حیات نو بلریا گنج کا خصوصی شمارہ۔وہ بڑے اچھے اہل قلم تھے۔ان کے مضامین ترجمان القرآن

لاہوراور ماہنامہ زندگی رام پور وغیرہ میں شائع ہوتے تھے۔ان کے قرآنی مقالات ڈاکٹر عمیر منظر نے مرتب کر کے شائع کئے ہیں۔

(۶۱) مولانا صدرالدین اصلاحی نامور مصنف ومحقق اور صاحب تصانیف کثیرہ تھے۔تفصیل کے لئے دیکھیں: ماہنامہ حیات نو بلریا گنج اعظم گڑھ کا خصوصی شمارہ۔

(۶۲) علامہ اقبال احمد خاں سہیل [۱۸۸۴-۱۹۵۵ء] اردو وفارسی کے نامور ادیب اور قادر الکلام شاعر تھے۔علامہ شبلی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ان کے شعروادب کی دولت سہیل صاحب کے حصہ میں زیادہ آئی تھی۔'کلیات سہیل' شائع ہو چکا ہے۔نعت نگاری کے میدان میں ان کی منفرد شناخت ہے۔ان کے نعتیہ مجموعہ 'موج کوثر' کا کوئی جواب نہیں۔مزید تفصیل کے لئے دیکھیں ڈاکٹر منور انجم: اقبال سہیل حیات اور شاعری۔ڈاکٹر شباب الدین صاحب، دانش سہیل، ناشر شعبہ اردو شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ

◆◆◆

[۷]

وفات شبلی پر خلیفہ عبدالحکیم

کی ایک نایاب نظم

۱۸ رنومبر ۱۹۱۴ء کو علامہ شبلی کا شہر اعظم گڑھ میں سانحہ وفات پیش آیا۔ ہر طرف صف ماتم بچھ گئی۔ نثر نگاروں نے نثر میں اور شعرا نے منظوم نذرانہ عقیدت پیش کیا۔ اس وقت اردو و انگریزی کے نامور اہل قلم، محقق ومصنف ، ماہر غالبیات واقبالیات ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم [۱۸۹۳ - ۱۹۵۹ء] سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں بی اے کے طالب علم تھے۔ انھوں نے ایک طویل تعزیتی نظم لکھ کر علامہ شبلی کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اس نظم کا عنوان یہ مصرع ہے:

پیکر شبلی میں تھی روح غزالی جا گزیں

یہ نظم روز نامہ زمیندار لاہور (مدیر: مولانا ظفر علی خاں) ۲۷ رنومبر ۱۹۱۴ء کے شمارہ میں شائع ہوئی ہے۔ اور کئی نوع سے اہمیت کی حامل ہے۔ ایک تو یہ کہ یہ نظم ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی دور طالب علمی کی یادگار ہے۔ اس سے ان کی اٹھان کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ نظم ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کے مجموعہ ''کلام حکیم'' مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی (م: جون ۱۹۷۳ء، لاہور] میں بھی شامل نہیں ہے۔ عدم شمولیت کا سبب بھی واضح نہیں۔ ممکن ہے فاضل مرتب کو اس کا علم ہی نہ رہا ہو؟ تیسری بات یہ کہ اس سے علامہ شبلی سے ان کی غایت محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ اس نظم کی ایک خوبی اس کی تشبیہات واستعارات بھی ہیں۔ اس بنا پر یہ نظم ہدیہ

ناظرین کی جاتی ہے۔

پیکرِ شبلی میں تھی روح غزالی جاگزیں

آہ! خانہ علم وہنر نے کھودیا اپنا مکیں
رہ گئی خاتم فقط غائب ہوا نقش نگیں

نورحق پاتا تھا اس میں دیدۂ باریک بیں
پیکر شبلی میں تھی روح غزالی جاگزیں

موت کی بیداد سے بچ کر نکل سکتے نہیں
آیت انفاس ہے اس کی کماں اس کی کمیں

خون کے آنسو بہائے قوم کے اقبال نے
ہوگئی گل پوش جس سے نظم اردو کی زمیں

حالی معجز بیاں اک عمر ماتم میں رہا
شعر کے دامن میں ٹانکے اشک کے درثمیں

فلسفی ، شاعر ، مورخ ، شبلی شیریں سخن
ذات میں جس کی صفات عالمانہ جمع تھیں

ہم سفراجڑے چمن کے تھے یہ سب جن میں سے ایک
مثل گنج بے بہازیرزمیں ہے اب دفیں

آج کل گوساری دنیا عرصہ پیکار ہے
موج زن ہے خون انگلستان سے لے کرتا بہ چیں

اس زمانے میں کہ چشم نکتہ رس کا قحط ہے
آسماں نے اک بصیرت اور کی زیر زمیں

کاٹتی ہے سیکڑوں چکر کئی صدیوں میں تب
گردش ایام تجھ سا شخص لاتی ہے کہیں

فلسفہ مذہب سے ٹکرایا تھا جب بغداد میں
خون مسلم سے بھرے تھے آستان وآستیں

قدرت حق نے تھے ایسے نکتہ داں پیدا کئے
صلح سے بدلی جنھوں نے آ کے جنگ عقل ودیں

تو نے بھی تو حامد و رازی کی صورت ہند میں
دین ودانش کے دلوں سے میٹ ڈالا نقش کیں

تیری آنکھوں نے پڑھا لوح دل رازی کا راز
سینہ سینا کی باتیں تجھ پہ سب روشن ہوئیں

توسریرعلم چڑھتا سر پہ تھا ایماں کا تاج
خادم اعلی ہے جو ہے وہ امیرالمومنین

جاہ وثروت سیرچشمی کے مقابل ہیچ ہیں
لاکھ سلطانوں پہ فائق تجھ سا خاکسترنہیں

جرات آموز بیان صدق تھا تیرا خلوص
آستانے پر حقیقت کے رہی تیری جبیں

رنگ تصویر کہن میں بھر کے تو دکھلا گیا
تیری گلکاری پہ ہردل نے پکارا آفریں

تیری باتوں میں تھا پنہاں نشہ جام طہور
تیرا ہر ایک شعر شیرینی میں رشک انگبیں

قوم کے جسم شکستہ کے لئے تھی مومیا
تھی ستون ملت بیضا تری رائے زریں

صفحہ دنیا پہ گو مثل قلم یک پا تھا تو   برق رفتار قلم کو پر پہنچ سکتی نہیں
بیش طوفاں صورت ساحل رہا ثابت قدم   اس قدر اپنی روش کی راستی پر تھا یقیں
عربدے اعدا کے کب تجھ کو مشوش کر سکے   کج ادائی پر ہوا کس روز تو چیں برجبیں

سیرت احمد لئے جاتا ہے سینے میں نہاں
سر پہ تیرے ہوگا ظل رحمت للعالمیں

(روزنامہ زمیندار لاہور، ۲۷ر نومبر ۱۹۱۴ء، ص ۱)

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی یہ نظم مجھے زمیندار کے کئی شماروں پر مشتمل ایک جلد میں ملی تھی، جس کی سلائی جلد ساز نے اس طرح کی تھی کہ کچھ الفاظ پر سوئی چلا دی تھی۔ میں مولانا غلام رسول مہر مرحوم [۱۸۹۵-۱۹۷۱ء] کے لائق صاحب زادے جناب امجد سلیم علوی صاحب کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے پنجاب لائبریری جا کر اصل سے ملانے کی زحمت اٹھائی اور تصحیح کر کے اشاعت کے قابل بنایا۔

◆◆◆

[۸]

علامہ شبلی کے نام منثور و منظوم

سپاس نامے

علامہ شبلی نعمانی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] کی عظیم الشان علمی و تعلیمی اور علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں متعدد مواقع پر ان کو منظوم و منثور سپاس نامے پیش کئے گئے۔ زیر نظر مقالہ میں ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

دار العلوم مصر میں

۱۸۹۲ء میں علامہ شبلی نے روم و مصر و شام کا سفر کیا۔ اس علمی سفر میں جب وہ فلسطین سے مصر پہنچے، اس وقت احمد قوصی مصر کے جدید و قدیم تعلیم کے مرکز اول ''دار العلوم'' میں طالب علم تھے۔ چونکہ اس دار العلوم مصر میں بیشتر طلبہ جامع از ہر کے فضلاء ہوتے تھے، اس لئے قیاس ہے کہ احمد قوصی بھی فاضل از ہر ہی رہے ہوں گے۔

علامہ شبلی جب اس دار العلوم کے معائنہ کے لئے گئے تو اس کے سکریٹری احمد بک نظیم نے احمد قوصی کو بلا کر کہا کہ قلم دوات لے کر بیٹھ جاؤ اور ان کی (علامہ شبلی) شان میں کچھ اشعار لکھو۔ چنانچہ وہ سامنے ایک بنچ پر بیٹھ گئے اور فی البدیہہ یہ اشعار لکھے:

محمد انت شبلی المعالی　　　لقد فقت الوری وعلوت قدرا

وقد اولیتنا شرفا و فضلا　　بتشریف زیارۃ ارض مصرا
فلا زلنا نراک بکل انس　　تزید تفضلا و نزید شکرا

(سفرنامہ روم ومصر وشام ص ۱۵۶)

ان اشعار کے بارے میں علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ ''اگر چہ شبلی المعالی کی ترکیب بے جوڑ ہے اور شعر میں اقوا ہے، تاہم خوبی زبان و برجستگی ادا کے لحاظ سے میں نے بہت داد دی۔''(۱)

علی گڑھ میں

بلاد اسلامیہ کے سفر سے علامہ شبلی جب واپس آئے تو ایم اے او کالج علی گڑھ میں لجنۃ الادب کی طرف سے ایک تہنیتی جلسہ کا انعقاد ہوا۔ جس میں متعدد اساتذہ، طلبہ اور کالج کے عمائدین نے شرکت کی۔ اس موقع پر فورتھ ایر کے طالب علم اور علامہ شبلی کے شاگرد خوشی محمد ناظر نے تہنیت کے چند اشعار پیش کئے۔

واپس آئے سیرِ روم و شام، مصر و زنگ سے　　آشیاں بلبل کو لایا سینکڑوں فرسنگ سے
ہند سے جب روم کو بستر اٹھا کر چل دیے　　تپ کی شدت تھی مگر کونین کھا کر چل دیے
پنجۂ احباب سے دامن چھڑا کر چل دیے　　ایک فقرے سے ہمیں ڈھارس بندھا کر چل دیے
ہر چہ بادا باد من کشتی در آب انداختم　　خانہ بر موجِ سمندر چوں حباب انداختم

خوشی محمد ناظر نے فارسی میں دو شعر اور بھی کہے ہیں۔ اس سے ان کے اپنے استاذ علامہ شبلی نعمانی سے محبت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

باز وقتِ گرمیِ بزمِ سخن آید ہمی　　بلبلِ گم گشتہ در صحنِ چمن آید ہمی
زینتِ ہر بزم و زیب انجمن آید ہمی　　آں ادیب و شاعر و ہسٹورین آید ہمی

اس موقع پر انہوں نے ایک فارسی نظم بھی پیش کی، جس کا مقطع یہ ہے:

شبلی غمزدہ آں جرعہ کش طرف بساط
ہم بہ آں طرزنوی زمزمہ خواں است کہ بود

شمس العلماء کا خطاب ملنے پر

جنوری۱۸۹۴ء میں شمس العلما کا خطاب ملنے پر علی گڑھ کالج میں متعدد تقریبات کا انعقاد ہوا، جس میں کالج کے تمام سربرآوردہ اشخاص سرسید احمد خاں، سید محمود، نواب محسن الملک، مولانا الطاف حسین حالی، نواب مزمل اللہ خاں، پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ، جسٹس کرامت حسین وغیرہ نے شرکت کی۔ اس جلسہ کی صدارت نواب محسن الملک نے کی۔ ان کی صدارتی تقریر اور جلسہ کی کارروائی انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوئی ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی [۱۸۸۴ - ۱۹۵۳ء] نے اسے حیات شبلی میں نقل کیا ہے۔ یہ خطبہ اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس دور میں علامہ شبلی کے بارے میں کالج کے سب سے بڑے محسن کے کیا خیالات تھے۔ نواب محسن الملک نے اپنی صدارتی تقریر کے آغاز میں کہا کہ

> ''صاحبو! اس وقت اس جلسہ میں دو قسم کے لوگ شریک ہیں۔ ایک طالب علم جن کو مولانا شبلی صاحب سے شاگردی کا فخر حاصل ہے۔ دوسرے اور احباب جن کو مولوی صاحب موصوف کی دوستی کی عزت حاصل ہے۔ میں اگرچہ بہ ظاہر دوسرے قسم کے لوگوں میں ہوں مگر اے صاحبو! درحقیقت میں پہلے طبقہ میں داخل ہوں..........عزیزو! مولانا شبلی صاحب صرف تمہارے ہی استاد نہیں ہیں بلکہ درحقیقت مجھ پر بھی ان کو استادی کا حق ہے۔ اگر تم نے چند قاعدے صرف ونحو کے ان سے سیکھے یا چند ابتدائی کتابیں ان سے پڑھی ہیں تو میں نے ان کی تصنیف وتالیف اور تقریر وتحریر سے بڑے فائدے حاصل کئے ہیں۔ کوئی روز ایسا نہیں ہوتا کہ ان کی صحبت سے کسی نہ کسی قسم کا علمی فائدہ مجھے نہ ہوتا ہو۔ یا ان کی باتوں سے کچھ نہ کچھ میری معلومات میں ترقی نہ ہوتی ہو۔ اس لئے اے میرے عزیز طالب علمو! نہ صرف بہ حیثیت ایک دوست ہونے کے بلکہ بحیثیت ایک طالب علم ہونے کے میں اس جلسہ میں شریک ہوا ہوں

اور میں مولانا شبلی صاحب کو اس معزز خطاب کے پانے پر جو گورنمنٹ نے ان کو دیا ہے، مبارک باد دیتا ہوں''۔(۲)

بعدازاں نواب صاحب نے علامہ شبلی کو شمس العلما کا خطاب ملنے پر پہلے حکومت کو، کالج کو اور پھر قوم کو مبارک باد دی۔ان کا خیال تھا کہ

''مولانا کو مبارک باد دینا تو ایک امر رسمی اور صرف رسم ظاہری کی تکمیل ہے۔وہ فی ذاتہ ہمیشہ سے علم کے آفتاب تھے اور گورنمنٹ ان کو خطاب دیتی یا نہ دیتی وہ سب کے نزدیک شمس العلما تھے''۔(۳)

علامہ شبلی کی ذاتی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا :-

''صاحبو! مولانا شبلی صاحب کی ذاتی خوبیوں اور ان کے علمی کمالات کا ذکر کرنا فضول ہے جن کو ان سے ملنے کی عزت حاصل ہے وہ ان کے ان صفات کا اندازہ کر سکتے ہیں جو خدا نے کوٹ کوٹ کر ان میں بھر دیئے ہیں''۔(۴)

پھر نواب صاحب نے علامہ شبلی کے علم وفضل، ان کی تصنیفات وتالیفات کی عظمت، علوئے مقام ومرتبہ اور ان کی عظیم الشان خدمات کا تذکرہ تفصیل سے کیا اور کہا کہ:

''جن کو ان کی تالیفات وتصنیفات کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ ان کی نظر کیسی غائر اور ان کا علم کیسا وسیع، ان کے خیالات کیسے بلند، ان کا ذہن کیسا تیز، ان کی تحریر کیسی پرزور، ان کا بیان کیسا صاف اور ان کی تحقیق کیسی عالمانہ ہے، وہ ہمارے زمانہ کے پہلے مصنف ہیں جنھوں نے اپنی تالیفات میں فصاحت بیان اور سلاست عبارت اور لٹریچر کی تمام خوبیوں کے ساتھ اعتدال اور بے تعصبی اور انصاف کا لحاظ رکھا اور شاعرانہ خیالات اور ایشیائی مذاق کے موافق مبالغہ، استعارہ اور عبارت آرائی اور تصنع کے بغیر بلاغت سے فلسفیانہ طرز پر سوانح عمری اور لائف کے لکھنے کا طریقہ جاری کیا۔

اور واقعات تاریخی کے تحقیق کرنے اور محققانہ طور پر واقعات اور معاملات پر رائے دینے اور نتائج کے اسباب بیان کرنے اور اخبار و روایات کے صدق و کذب کے دریافت کرنے کا راستہ بتایا اور ایسے زمانہ میں جب کہ ہماری قوم کا مذاق بگڑا ہوا ہے اور ایسے وقت میں جب کہ سوائے افسانوں اور ناولوں کے کسی اور قسم کی کتابوں کی قدر نہیں ہے، ہمارے مولانا منجملہ ان دو تین مصنفین کے ہیں جن کی تالیفات کی نہایت قدر کی گئی اور جن کو قوم نے نہایت شوق سے دیکھا اور جس سے مسلمانوں نے بہت فائدہ اٹھایا اور جس نے ان کے دلوں میں ایک نیا مذاق پیدا کیا اور جس نے مشاہیر روزگار کے حالات زندگی کے لکھنے کا طریقہ اور اس کا مقصد بتایا اور ہمارے مردہ لٹریچر میں بلکہ ہمارے مردہ خیالات میں ایک نئی جان ڈال دی۔ فللہ درہ وعفی اللہ اجرہ .(۵)

مولوی محمد داوٗد عباسی [۱۸۶۲-۱۹۰۰ء] نے جو اس وقت طالب علم تھے اس موقع پر عربی میں منظوم تہنیتی نظم پیش کی۔

حمد لمن جعل النجوم دراریا والشمس نورا للحنادس ماحیا	اس کا شکر جس نے تاروں کو روشن اور سورج کو روشنی بنایا جو تاریکیوں کو مٹا دیتی ہے،
اشرقتَ شمساً من سماء معالم لتمدَّ اقمار العلاء معالیا	تو نشانیوں کے آسمان سے سورج ہو کر چمکا تا کہ بلندی کے چاندوں کو اور بلندی میں بڑھا دے
اضحیٰ بفیضک روضُ علمٍ ناضرا من بعد ان قد کان دهراً زاویا	تیرے فیض سے علم کا چمن شاداب ہو گیا اس کے بعد کہ وہ ایک زمانہ تک مرجھایا ہوا تھا
لا غروَ لو ادعوک روحَ زماننا	کوئی شبہ نہیں اگر میں تجھ کو اپنے زمانہ کی روح کہہ کر پکاروں

تحي لعلم الدين عظماً باليا — جوعلم دین کی بوسیدہ ہڈی میں پھر زندگی پیدا کررہی ہے۔

علّامةٌ مستنبط من آية القرآن — علامہ ہے جوقرآن پاک کی آیت سے چھپا بھید
سرّاً خافياً ومعانيا — اور معنوں کا پتہ لگاتا ہے

حينا يحبّر فی العلوم رسائلاً — کبھی وہ علوم کے رسالے نقش کرتا ہے
حينا يشيّد للفنون مبانيا — اور کبھی فنون کی عمارتیں بلند کرتا ہے

وهو الّذِی شرح المهيمنُ صدره — یہ وہ ہے جس کے سینہ کو خدا نے کھول دیا ہے
فغدالابناء المعارف تالياً — تو وہ اگلے اہل علم کا پیرو ہو گیا

لله دَرُّ مدرّسٍ تدريسه — ایسا اچھا مدرسہ ہے کہ اُس کا درس
سيلٌ اتیٰ وقد يغشّی واديا — ایک سیلاب ہے جو وادی میں چھا جاتا ہے

سَحبان وقتٍ لا يُشَقّ غباره — اپنے وقت کا سحبان جس کے گرد تک کوئی نہیں پہنچ سکتا
من كان للفرد الوحيد مجاريا — کون فردِ فرید کا مقابل ہوسکتا ہے

قُسّ الفصاحة لا يُنال مقامه — فصاحت میں قس بن ساعدہ ہے جس کے رُتبہ کو کوئی نہیں پہنچ سکتا
من كان للشمس المنيرة ثانياً — اس روشنی بخشنے والے آفتاب کا ثانی کون ہے

ان قال فی العربیّ شعراً فاق — اگر وہ عربی میں شعر کہے تو حسانؓ سے بڑھ جائے
حسّاناً وفی العجمی فاق قانيا — اور اگر فارسی میں کہے تو قاآنی سے آگے نکل جائے،

قد یخلب الالبابَ سحر بیانہ	اُس کے حسن بیان کا جادو عقل کو لے لیتا ہے
اذ ما تصدیٰ خاطباً او شادیاً	جب وہ خطیب ہوکر یا شاعر ہوکر نغمہ سرا ہو

ھو حصرم الاخبار غیر مساجل	وہ تاریخ کا اتھاہ سمندر ہے
یعطی الوریٰ مرجانۃ لآ لیا	جو لوگوں کو مرجان اور موتی دیتا ہے

اس نظم کا اردو ترجمہ مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے ہے اور حیات شبلی سے نقل کیا گیا ہے۔(حیات شبلی ص ۲۷۰)

علامہ شبلی کے ایک اور شاگرد حافظ ولایت اللہ نے بھی اس تقریب سپاس میں منظوم سپاس نامہ پیش کیا۔ علامہ شبلی نعمانی کو جس وقت شمس العلما کا خطاب ملا، اس وقت حافظ ولایت اللہ صاحب ایم، اے، او، کالج علی گڑھ میں بی، اے کے طالب علم تھے۔ خطاب ملنے کی خوشی میں ایم اے او کالج میں ۱۹؍جنوری ۱۸۹۴ء کو جو جلسہ منعقد ہوا تھا، اس میں حافظ ولایت اللہ نے بھی شرکت کی تھی۔ اس موقع پر انہوں نے علامہ شبلی کی مدح میں ایک اردو نظم پیش کی تھی، جو ان کے مجموعہ کلام ''سوز و گداز'' میں شامل ہے:

آج یہ کیوں نظر آتے ہیں خوشی کے ساماں	در و دیوار سے آثار مسرت ہیں عیاں
زیب و زینت نہیں کچھ ایک جگہ پر موقوف	ساری دنیا نظر آتی ہے مجھے باغِ جناں
دیکھنے والوں کی آنکھوں میں کھپا جاتا ہے	دل کو بھاتا ہے بہت آج کے دن کا یہ سماں
دیکھ کر سبزے کی ہر سمت بہار دلکش	فرشِ اطلس کا مجھے ہوتا ہے ہر لحظہ گماں
جس طرف جایئے غنچے ہیں تبسم کرتے	باغِ عالم میں جدھر دیکھئے گل ہیں خنداں
باغ ہو دشت ہو صحرا ہو غرض کچھ بھی ہو	نقشہ خلد ہی پاتا ہوں میں جاتا ہوں جہاں
دھوم صحرا میں ہے جنگل میں ہے برپا منگل	آج ویرانہ کا معدوم ہے دنیا سے نشاں
سب کے منہ سے ہیں بلند آج خوشی کے نعرے	شاد و خرم نظر آتا ہے ہر اک پیر و جواں

دست قدرت نے گہربار جو ہونا چاہا — بر آیا دُر شہوار سے بھر کر داماں
نہ رہی شکل وہ دنیا کی و ما فیہا کی — کچھ سے کچھ کر گئی ایک بارش ابر باراں
دشت و صحرا ہوئے گلزار، بہار آ پہنچی — رحمتِ پاک سے سرسبز ہوا باغِ جناں
سر کے بل آ گے ہی بڑھتی تھی نگاہِ پُر شوق — اک تماشا پہ تھیں سو جان سے آنکھیں قرباں
سخت حیرت تھی خدایا یہ خوشی ہے کیسی — جا رہا تھا میں اسی فکر میں غلطاں پیچاں
ناگہاں کان میں آواز یہ آئی میرے — باعث غور ہے کیا کیوں ہوے ایسے حیراں
خیر ہے فکر یہ کیسی ہے؟ تعجب کیسا؟ — مہرباں ہوش میں آؤ ہو تم اس وقت کہاں
جشن نو روز ہے اک دھوم مچی ہے ہر سو — واں کے چلنے کا بھی کچھ تم نے کیا ہے ساماں
یہ صدا کان سے پہنچی جو اتر کر دل میں — ہو گیا مجھ پہ عیاں صاف یہ سب رازِ نہاں
دیکھنے کو جو بہت میری طبیعت چاہی — ساتھ سب لوگوں کے اس سمت ہوا میں بھی رواں
لیے جاتا تھا مجھے شوق وہاں ہاتھوں ہاتھ — جا رہا تھا میں نہایت خوش وخرم شاداں
چشم مشتاق جسے ڈھونڈ رہی تھی ہر سو — مجھ کو دکھلائی دیا دور سے ناگہ وہ مکاں
خوش نما دل کش و دل چسپ تھی جس کی تعمیر — جس کی صورت سے نمایاں تھی بہت شوکت وشاں
پاس جا کر جو نظر کی تو وہاں پائے بہم — ہند کے جملہ اراکین و مشیر و اعیاں
عقل و دانش کو ہوئی جن سے کہ زینت حاصل — عزت وشان کی جن سے کہ بڑھی عزت وشاں
عدل سے جن کے ممالک ہوئے معمور تمام — جن کے ہاتھوں سے یہ سرسبز ہوا ہندوستاں
پائی یہ نشو و نما علم و ہنر نے جس سے — ہے بجا جن کو اگر کہئے کہ ہیں ہند کی جاں
ناگہاں ایک خموشی ہوئی سب پر طاری — جب کہ دربار میں نافذ ہوا شاہی فرماں
بہرِ تعظیم کھڑے ہوگئے حضّار تمام — ہو گیا پھر ہمہ تن گوش ہر اک پیر و جواں
سن کے کچھ پھول گئے مارے خوشی کے احباب — دل سے مت پوچھئے کچھ فرط مسرت کا بیاں
ہوئے شمس العلما آج جناب شبلی — ہو گیا چار سو اس مژدہ کا فوراً اعلاں
فخر کرتا ہے بہت جن پہ علی گڑھ کالج — بلکہ یوں کہئے کہ ہے ہند بھی جن پر نازاں

مصر اور شام خجل ہیں عربی سُن کے اگر	فلسفہ دیکھ کے شرمندہ ہو ملکِ یوناں
فارسی کی جو بھنک کان میں پڑ جائے اگر	پھر کبھی نام نہ لے شرم سے اپنا ایراں
تم کو شمس العلما کا یہ مبارک ہو خطاب	جب تلک شمس رہے اوجِ سما پر رخشاں
پس دعا ہے یہ ولایتؔ کی ہمیشہ یا رب	یہ لقب پھولے پھلے آپ کے زیرِ داماں
سبز و شاداب یہ جب تک کہ رہے باغ علوم	شمس کی طرح رہیں آپ بھی سر برتاباں

حافظ ولایت اللہ علامہ شبلی کے ہمیشہ مداح رہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ ایک باران سے دہلی میں ملاقات ہوئی تو وہ اپنے استاذ علامہ شبلی کا ذکر کرتے رہے۔

(حیات شبلی ص ۲۱۰، طبع جدید ۲۰۰۸ء)

علامہ حمید الدین فراہی [۱۸۶۴-۱۹۳۰ء] نے بھی اس موقع پر منظوم سپاس نامہ پیش کیا:

یا خیر من یسمو الی العلیاء	کالشمس بازغةً بوسط سماء
اے ان سب میں بہتر جو بلندی کی طرف اونچے ہوتے ہیں	آسمان کے وسط میں آفتاب کی طرح درخشاں ہوکر
قد کنت قدماً للمعالی سامیا	اورثته عن شیمة الآباء
تو پہلے سے بلندی کی طرف بڑھ رہا تھا	تو نے اپنے اسلاف سے یہ وراثت میں پایا
فلئن سموت الی المکارم والعلیٰ	فلقد نشأت بعزةٍ قعساء
تو اگر تو عزت کے مقام اور بلندی کی طرف بڑھا تو	کوئی تعجب نہیں کیوں کہ تو نے عزت میں پرورش پائی۔
لا غروَ نصل السیف ان یك صارماً	او یستهلّ البرق بالألاء
کوئی تعجب کی بات نہیں اگر تلوار کی دھار	کاٹ رکھتی ہو یا بجلی روشنی لے کر چمکے
فلانت بالعزمات سیفٌ صارم	ولانت برقٌ لامعٌ بذکاء
کیوں کہ تو اپنے پختہ عزم میں شمشیر برّاں ہے	اور تو ذکاوت میں برق لامع
لاذت بجانبك العلوم فانها	لولا تصنها اٰذنت بفناء
علوم نے تیری پناہ چاہی کیوں کہ	اگر تو ان کو نہ بچاتا تو وہ فنا ہو چکے تھے۔
قد امحلت ارض العلوم واصبحت	عرصاتها کسمائق البیداء

علم و فن کی سرزمین خشک ہوگئی تھی　　اور اس کے میدان صحرا بن گئے تھے

لعبت بها هوجُ الرياح تنوبها　　من كل عاصفةٍ من النكباء

اس کے چاروں طرف سے آندھیاں اس سے کھیل رہی تھیں　　اور مصیبت کا طوفان اس پر آرہا تھا

فضللت تمطرها بستح واكف　　صوب الربيع بديمة هطلاء

تو تو ابر باراں بن کر اس میں برسا　　بہار کی بارش موسلا دھار

فربت رياض العلم منك نوّرت　　مهتزة بغصونها الخضراء

توعلم کی کیاریاں تجھ سے پروان چڑھیں اور　　ان کی سبز شاخوں میں جھوم کرشگوفے نکلے

علمتنا سبل الرشاد وانّما　　كنا كخابط ليلةٍ ليلاء

تو نے ہم کو ہدایت کا راستہ بتایا　　حالاں کہ ہم ایسے تھے جیسے کوئی اندھیری رات

كنا بمهجلة يخاف بها الردىٰ　　فهديتنا المحجةِ بيضاء

ہم ایسے خوفناک مقام میں تھے جس میں ہلاکت کا ڈر تھا　　تو تو ہم کو کھلے صاف راستہ پر لے آیا

ولأسئلنَّ اللّٰه طول بقاءكم　　مى كل بكرتنا وكلّ عشاء

اور ہم اللہ سے آپ کی زندگی کی　　ہر صبح اور شام دعا مانگیں گے

واهنّئنّكم بما اعطيتم　　من خير ما وجدوا من الاسماء

اورآپ کواس کی مبارک باد دیتے ہیں کہ آپ کوانہوں نے　　اپنے نزدیک سب سے بہتر لقب سے ملقب کیا

ان كان تلك الشمس شمس سمائها　　فلصرت شمس العلم والعلماء

اگر یہ آفتاب اپنے آسمان کا سورج ہے　　تو تو علم اور علما کا آفتاب ہے

اذ انت شمس والعلوم سمائكم　　فالشمس شمسى والسماء سمائى

جب آپ آفتاب ہیں اورعلم وفن آپ کا آسمان ہے　　تو آفتاب ہمارا آفتاب ہےاورآسمان ہمارا آسمان ہے

اس قصیدے میں کل ۱۶/اشعار ہیں۔جبکہ دیوان حمیداورعربی دیوان میں۱۳-۱۱۳اشعار ہیں۔گویا تین شعرحذف کردئے گئے ہیں۔البتہ اقبال احمد خاں سہیل نے سیرت شبلی میں ۱۸/ اشعاردرج کئے ہیں۔

مولانا فراہیؒ نے اس خوشی کے موقع پر ایک اور قصیدہ کہا ہے جو ان کے کسی دیوان میں شامل نہیں ہے۔ البتہ ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ عربی قصیدہ مولانا بدرالدین اصلاحی مرحوم کے یہاں موضع نیاؤج میں ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی کو ملا تھا اور انہوں نے ''ذکر فراہی'' میں اسے درج کر دیا ہے:

لدی العقل شمس غیر ماهوللحس　　فانک شمس العقل یا لک من شمس
فمن ضوء تلک الشمس تجلی عیوننا　　ونورک منه تنحلی ظلمة النفس
ومالشمس الا کل یوم کمابدت　　وانک کل الیوم ابهی من الامس
لقد سعدت ایا منا کلها بکم　　والشمس ایام من السعدوالنحس
ویخفی ضیاء الشمس عند مسائنا　　ونورک مبسوط انصبح ام نمسی
لقد کنت شمسائم سمیت با سمها　　کذا الاسم بعد العین مافیه من باس
لیهناک هٰذاالاسم ثم منحتم　　بطول بقاء صانه الله من بوس
واورث نور العلم یمحو غیاهب ال　　جهالات لایمحوه عصر ولاینسی
وابلج وجه الدهر من کلماتکم　　مدی الدهر ماخطت یراع علی الطرس

ان قصائد سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ علامہ شبلی سے مولانا فراہی کو کس درجہ محبت تھی۔

علامہ شبلی کو بھی ان پر بڑا ناز تھا۔ وہ جن شاگردوں کو اپنا جانشین بنانا چاہتے تھے۔ مولانا فراہی ان میں سرفہرست تھے۔ متعدد خطوط میں اس کا ذکر ملتا ہے۔

شمس العلما کا خطاب ملنے پر ان کے ایک اور مایہ ناز شاگرد مولانا ظفر علی خاں نے درج ذیل فارسی قصیدہ پیش کیا۔

سحر گاہاں دلم پامالِ غم بود و پریشانی　　مکدر مطلع خاطر بد از اندوہ پنہائی
گہے بر بے سرو سامانی خود نالہ می کردم　　گہے خواندم حدیث گردش ایامِ طولانی
گہے برکردۂ خود انفعالم دست می دادی　　گہے کردہ نظر بر معصیت خوردم پشیمانی
چوموجِ غم ز سر بگذشت گشتم عازمِ گلشن　　کہ درمانِ دل زارم شود زانساں بآسانی

شگفتہ غنچۂ دل شد ز فرطِ فرحت و بہجت　　عروس دہر را پیرایۂ دیدم چو نورانی

گل و بلبل بہم محو ادا و عشوہ و غمزہ　　چو زلفِ مہوشاں گیسوے سنبل در پریشانی

خرام نازکبک و رقص سرود خندۂ گلہا　　دلم برد و شدہ روحم نثار صنعِ یزدانی

دمیدہ لالۂ حمرا کنارے جوے کوثروش　　ہمی شد از جمالش غرق خوں لعلِ بدخشانی

وزید از گلستاں باد صبا آہستہ آہستہ　　مشامِ جاں مُعطر شد ز بوے مستِ ریحانی

گلاب و نسترن شبّو و نسریں نرگس و سوسن　　بہ ہر یک عشوۂ خاصے بد از اندازِ ارزانی

زشبنم لالہ داغِ خود بہ اندازِ نکوشستہ　　شمیم یاسمین و یاسمن در عنبر افشانی

ہزاراں مرغِ خوش الحاں نشستہ برسر اغصاں　　بصورت دلربا بودند محوِ تہنیت خوانی

مہ نوکشتیِ بہر نثار نقرہ پر کردہ　　کواکب بر فلک مصروف ہرسو در دُر افشانی

چو ایں نظارہ را دیدم بجیبِ فکر سر بردم　　کہ بہرِ کیست ایں آرایش و تزیینِ لاثانی

دریں اثنا مرا از ہاتفِ غیبی ندا آمد　　نمی دانی مگر تو اے غریقِ بحرِ حیرانی

کہ فخرِ قوم و مولانائے شبلی را پئے علمش　　خطابے شد عطا واللہ ز فیضِ جودِ سلطانی

زمیں ہم آسماں ہم چہرہ افروزند بہرِ او　　معطّر باغِ دہرا ست از پئے شبلی نعمانی

بحمد اللہ کہ درِ درجِ حکمت را پس از عمرے　　ز عدلِ خسروی شد گرم بازارِ درخشانی

نہ یارائے ثنائے تو قلم رانے زبانم را　　قطار عالماں انجم، میانش شمس تابانی

کنندا ے کانِ معنی علم و فضل و دانش و حکمت　　بیک پا ایستادہ بر خیانت پاستاں بانی

زمین شعر از فیضت پر از گلہائے بوقلموں　　سخن را دادۂ سرمایہ اے بحرِ سخندانی

کند پہنائے مضمونِ لطیف و خوش بیکدم طے　　سمندِ کلکِ تو ہر گہ شود سرگرمِ جولانی

براتے دادہ از فکرِ خود عرفی و صائب را　　کجا ہم پایہ ات باشند خاقانی و قاآنی

بہاراں نفحۂ باشد ز گلزارِ کمالِ تو　　ز بحرِ عقل و فہمت رُشحۂ ابریست نیسانی

خداوند کریمت لحنِ داؤدی عطا کردہ　　کنی تسخیر دلہا چوں کُنی ترتیلِ قرآنی

نوائے نغمہائے شکّریں تاخیز از گلبن　　صدائے بلبل آید تا ز شاخِ سرو بستانی

زچشم زخمِ دوراں درسلامت باشی وایمن معین و یاور و ناصر ترا تائید ربّانی

مولانا الطاف حسین حالی نے بھی عربی میں اس موقع پر ایک مدحیہ نظم پیش کی تھی، جس کا عنوان ''من الحبیب الی الحبیب'' ہے۔

یا وحیداً من الکرام فریدا وعزیزاً کمثل علقٍ نفیس

اے بڑے آدمیوں میں یکتا اور یگانہ اور نادر الوجود مثل نفیس و نادر چیز کے

انت اولی بان تلقّب شمساً بل باَنْ یجعلوك شمس الشموس

تو اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ تجھ کو آفتاب کا لقب دیا جائے بلکہ اس بات کا کہ تجھ کو آفتابوں کا آفتاب قرار دیا جائے

انت شمس الھدیٰ ولست بشمس یعتریھا الخنوس بعد خنوس

تو ہدایت کا آفتاب ہے اور وہ آفتاب نہیں جس کو غروب پر غروب لاحق ہوتا ہے

انت طھّرت ذیل دین مبین لوّثته اللئام بالتدلیس

تو نے دین مبین کے دامن کو پاک کیا جس کو کہ کمینوں نے فریب دہی سے آلودہ کردیا تھا

ثم دافعت عن امامٍ تقی کان بعد النبی خیر رئیس

پھر تو نے اس امام[2] پاک کی طرف سے مدافعت کی جو پیغمبر خدا کے بعد سب سے بڑا سردار تھا

وعن الحق قد کشفت غطاء بعد ما اغلقوہ بالتلبیس

اور تو نے حق سے پردہ اُٹھایا بعد اس کے کہ لوگوں نے اس کو دھوکہ سے پردہ میں چھپادیا تھا

سرتَ فی الارض برّاً و بحراً للمعالی ولا لأمر خسیس

تو نے دنیا کے بحر و بر کی سیر کی اعلیٰ مقاصد کے لیے نہ کسی ذلیل غرض کے لیے

قلّدوك التزام مدرس قوم فیه یرجیٰ لھم کمال النفوس

تجھ کو قومی مدرسہ کی خدمت سپرد کی گئی جس میں کہ نفوس کی تکمیل کی امید کی جاتی ہے

فتقلّدت والتزمت لزوماً خدمة المسلمین بالتدریس

تو نے اس خدمت کو قبول کیا اور درس وتدریس سے ان کی خدمت کا فرض ادا کیا

قمت بالدرس والدراسة فیھم فارغاً عن ریاسة و رئیس

تو تعلیم اور درس میں مشغول ہوا	ریاست اور رئیسوں سے بے پروا ہو کر
وجعلت الکمال غایة همٍّ	واتخذت الکتاب خیر جلیس
اور تو نے کمال کو اپنا انتہائے مقصد قرار دیا	اور کتاب کو عمدہ ہم نشیں بنایا
فعلی القوم لازماً لك حق	کلّهم من وجوههم ورؤس
پس قوم میں جس قدر اکابر و اعیان ہیں	سب پر تیرا لازمی حق ہے
صانك الله عن مکاره حتی	صرت کالقلب آمنا فی الخمیس
خدا تجھ کو مکروہات سے بچائے	یہاں تک کہ تو اس طرح محفوظ رہے جس طرح فوج میں قلب کا حصہ

(حیات شبلی ص۳۱۵-۳۱۶، طبع جدید۲۰۰۸ء)

مولوی نذیر احمد دہلوی نے شمس العلما کا خطاب ملنے پر عربی میں تقریر کی اور کہا کہ

یا ایها السادة الکرام ! یشق علی ان	معزز حضرات ! میرے لئے یہ امر تکلیف
افرع اذ انکم بعد اذ فرغنا من تنقل	دہ ہے کہ اس کے بعد کہ ہم لوگ خوش مزہ
الفواکه الشهیة والالوان اللطیفة	میووں اور عمدہ ناشتوں سے پیٹ بھر چکے
وکیف یمکن لی ان اعد فضائل	ہیں، آپ کی سمع خراشی کریں اور یہ کیسے
مولانا المکرم واحصی محامده مالی	ہوسکتا ہے کہ ہم مولانا کے فضائل گنائیں
ان اقول انه سحبان فی الفصاحة	اوران کے محامد شمار کریں، میں یہ کیسے کہوں
ومالی ان اقول انه قس فی البلاغة	کہ وہ فصاحت میں سحبان، بلاغت میں قس
ومالی ان اقول انه قانی فی سلاسة	اور سلاست زبان اور لطافت نظم میں قاآنی
لسانه ولطافة نظمه بل انشد	نہیں بلکہ میں متنبّی کا یہ شعر پڑھ دیتا ہوں:

هذاالشعر للمتنبی اذقال:

خذماتراه ودع شیئاً سمعت لبه

فی طلعة الشمس مایغنیك عن زحل

تفتخر اللجنة الادبية بان اعظم اركانها بل بانيهالقب بشمس العلماتهنئة الآن بهذا الاعزاز والاكرام ، اختم كلامي بتشكر السادة الذين شرقونا بقدومهم والذين كرمو نا باللطف والاحسان ، وان الله لا يضيع اجر المحسنين.	لجنۃ الادب فخر کرتی ہے کہ اس کے سب سے بڑے رکن ، بلکہ بانی کوشمس العلما کا لقب دیا گیاہے، وہ ان کو ان کے اس اعزاز پر مبارک باد دیتی ہے،ہم ان معزز حاضرین کے شکریہ پرجنہوں نے اس جلسہ میں شرکت کی اور تشریف لائے ،اپنی تقریرختم کرتے ہیں ،اللہ تعالی نیکی کرنے والوں کی نیکی کو برباد نہیں کرتا۔

[حیات شبلی ص۲۷۴-۲۷۵]

حیدرآباد میں

حیدرآباد کے ایک سفر میں وہاں کے علماء اور اہل فضل وکمال نے بھی سپاس نامہ پیش کیا تھا جو دارالمصنّفین کے میوزیم میں آویزاں ہے۔ یہ سپاس نامہ مولوی عزیز مرزا نے پیش کیا تھا۔ جو حسب ذیل ہے۔

بخدمت فیض درجت جناب فضیلت انتساب شمس العلماء
مولوی محمد شبلی نعمانی صاحب تمغۂ مجیدیہ دام افضالکم

عالیجناب!

ہم لوگ جنہیں آپ کے ہم ملت ہونے کا افتخار حاصل ہے،اس موقع پر جب کہ آپ شہر فرخندہ بنیاد حیدرآباد میں تشریف فرما ہوئے ہیں آپ کے خیر مقدم کے لئے حاضر ہوئے ہیں اور ان احسانوں کو یاد کر کے جو آپ نے قوم اور ملک پر اپنی عالم گیر تصنیفات کے ذریعہ سے کئے ہیں شکر گذاری کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کی پر جوش ’’مثنوی صبح امید‘‘(٦) نے سب سے پہلے ایک نئے مگر دل ربا انداز سے قومی ترقی کے آفتاب کے طلوع ہونے کی خوش خبری سنائی اور

مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم (۷) نے ہمارے علمی عروج اور دماغی ترقی کی خوشگوار داستان سنا کر ہمارے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ جب ہمارے اجداد نے اس تاریکی کے زمانہ میں یہ کچھ کیا تو ہم اس روشن زمانہ میں کیا کچھ نہیں کر سکتے۔ آپ کی مورخانہ تحقیق نے مامون الرشید کے حالات (۸) اس خوبی سے جمع کئے کہ اسلامی سلطنت کی عظمت و جبروت اور دربارِ خلفاء کی شان وشوکت کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ گیا اور وہ اسباب جن کے لحاظ سے اس زمانہ میں مسلمان دوسری قوموں سے میدان تہذیب و شائستگی میں آگے تھے خود بخود ظاہر ہو گئے۔ آپ نے سیرۃ النعمان (۹) میں ...... ایک ایسے پیشوائے مذہبی کے متبرک حالات سے ہم کو آشنا کیا جس کی بے لوث زندگی بعد میں آنے والوں کے لئے ایک عمدہ نمونہ تھی بلکہ یہ بھی ثابت کر دیا کہ شریعت غزائے مصطفوی جس طرح نجات اخروی کے لحاظ سے صراط مستقیم ہے، اسی طرح دنیوی معاملات کے لئے بھی ایک عمدہ دستور العمل ہے اور یورپین مصنفوں کا یہ خیال کہ وہ رومن جورس پروڈنس کی ممنون احسان ہے راستی سے کس قدر بعید ہے۔ آپ نے کتب خانہ اسکندریہ (۱۰) کے متعلق نہایت عالمانہ تحقیق سے کام لے کر اس دھبہ سے اسلام کی دامن عزت کو بالکل پاک وصاف کر دیا جو عیسوی تعصب نے ایسے اصرار سے لگایا تھا کہ ایڈورڈ گبن جیسے نامور مورخ کی پر جوش کوششیں بھی اس کو نہ مٹا سکیں۔ آپ نے یورپین نکتہ چینیوں کے مقابلہ میں قطعی طور پر ثابت کر دیا کہ جزیہ (۱۱) کی بنیاد مذہبی تعصب نہ تھی بلکہ وہ ایک قومی ٹیکس تھا جس کی ضرورت اس زمانہ میں بھی مسلم ہے اور حال میں جب ارمنی سازشوں کی بدولت یورپ میں دریائے تعصب ایسا جوش زن ہوا کہ خود اسلام کو بنی نوع انسان کے حق میں قہر الٰہی سمجھنے لگے تو یہ آپ ہی کی باریک نظر اور پر زور قلم تھا کہ جس نے حقوق الذمیین (۱۲) کی تشریح کر کے بتا دیا کہ جیسے فیاضانہ اصول شریعت اسلامیہ میں مفتوحین سے برتاؤ کے متعلق قائم کئے گئے ہیں ان کی نظیر دنیا کی تاریخ میں بہت مشکل سے مل سکتی ہے۔ آپ نے دراصل تاریخ سے اس کی بوسیدہ ہڈیوں میں روح تازہ پھونک کر ایک ایسا کام لیا ہے جو ہمارے خیال میں بھی نہ تھا اور اس لحاظ سے اردو لٹریچر ہمیشہ آپ کا ممنون احسان رہے گا۔ آپ نے صرف اپنے قلم اور دماغ ہی سے امت مرحوم کی حمایت نہیں کی ہے بلکہ آپ کے علمی

ذوق اور اسلامی جوش نے ایک دور و دراز سفر اختیار کیا (۱۳) اور وہاں نے ایک ایسا بیش بہا تحفہ ساتھ لائے جس نے ہمارے ذخیرہ معلومات میں معتد بہ اضافہ کرنے کے علاوہ ہماری قومی ہمدردی کو وسیع کر کے اس سے ہمارے رابطہ اتحاد کو اور بھی مضبوط کر دیا۔ اگر چہ حضرت سلطان المعظم اور سرکار عظمت مدار اور خود ہماری سرکار ابد پائدار نے آپ کی بے لوث کوششوں کی قدر دانی میں غفلت نہیں کی ہے، لیکن آپ جیسے بزرگوں کی اصلی قدر دانی وہی ہے جو پبلک کی طرف سے ہو۔ آپ کی تصنیفات سے ہم حیدرآبادی بھی اسی طرح مستفیض ہوئے ہیں جس طرح کہ ہندوستان کے دوسرے خطہ کے لوگ ہو سکتے ہیں اور اس لئے ہم پھر اس موقع پر اپنی دلی احسان مندی کا اظہار کر کے خدا سے دعا کرتے ہیں کہ آپ مدت دراز تک اسلام اور قوم کی خدمت گذاری کے لئے زندہ و برقرار اور ہمارے لئے باعث افتخار رہیں۔ آمین۔ ثم آمین۔

نوٹ: اس سپاس نامہ پر حیدرآباد کے متعدد اہل علم و دانش کے دستخط ہیں۔ جن کے نام پڑھے جا سکے وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ سید شاہ عبدالرحیم قادری — ۲۔ تراب جنگ
۳۔ رکن الملک خاں دوراں — ۴۔ عماد نواز جنگ
۵۔ محمد سلیمان بیرسٹرایٹ لا — ۶۔ سید نثار حسین
۷۔ انتظام حسین — ۸۔ جہاں گیر یار جنگ
۹۔ تفضّل یار جنگ — ۱۰۔ قاضی میر احرار صاحب
۱۱۔ سیف الاسلام۔ وکیل ہائیکورٹ — ۱۲۔ حیدر یار جنگ
۱۳۔ سرفراز حسین — ۱۴۔ حسن یار جنگ
۱۵۔ انتظام جنگ — ۱۶۔ مولوی حکیم عبدالرحمٰن سہارنپور
۱۷۔ محمد عبدالباقی۔ وکیل ہائی کورٹ — ۱۸۔ سید ابوالقاسم۔ وکیل ہائی کورٹ
۱۹۔ بدر عالم — ۲۰۔ محمد عبداللہ
۲۱۔ فدا حسین خاں۔ وکیل ہائی کورٹ — ۲۲۔ محمد نصرالدین

۲۳۔ محمد وجیہ الدین۔ مدرس دارالعلوم ۲۴۔ سید محمد مہدی خاں
۲۵۔ سرفراز حسین ۲۶۔ نصیر الزماں خاں
۲۷۔ محمد زماں ۲۸۔ محمد وحید الدین۔ مدرس دارالعلوم
۲۹۔ سید لطف علی ۳۰۔ سید لطف علی......
۳۱۔ مدارس دارالعلوم ۳۲۔ میر نثار حسین

مسلم انسٹی ٹیوٹ کلکتہ میں

خان بہادر سید رضا علی وحشت [۱۸۸۱-۱۹۵۶ء] کا شمار اردو و فارسی کے نامور شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ علامہ شبلی کے فضل و کمال کے بڑے معترف و مداح اور ان کے بڑے عقیدت کیش تھے۔ ایک بار انہوں نے علامہ شبلی کو مسلم انسٹی ٹیوٹ کلکتہ آنے کی دعوت دی۔ علامہ شبلی کلکتہ پہنچے تو ان کے اعزاز میں مسلم انسٹی ٹیوٹ میں ایک جلسہ منعقد کیا اور ان کے استقبال میں چند فارسی اشعار کہے۔ جو ان کے دیوان میں موجود ہیں۔

نوید عشق رسانید پیک فرخ فال بخویش از طرب اے مسلم انسٹی ٹیوٹ ببال
کدام نو گل مہر و وفا دمید ایں جا کہ بوئے روح فزایش ز دل ربوہ ملال
کدام صاحب علم و ہنر رسید ایں جا کہ بہر دیدن او جمع گشتہ اہل کمال
کدام مخزن صدق و صفا قد آرا شد کہ ہم چو آئینہ برجائے ماندہ آب زلال
کدام ما ہر فن سخن زبان بکشود فرو چکید گہر ہائے بے عدیل و بے مثال
مگر بیامدہ علامہ زماں شبلی کہ دارد از نفس شاہد کمال جمال
فدائے معنی رنگیں و نکتہ سنجی او کہ آفریں ز زباں ہا نماید استقلال
بلا کہ شوخی تحریر و حرف گفتن او چناں بود کہ بعاشق رسد پیام وصال
زہے صفائے کلام و لطافت سخنش بداں رسد کہ بفریاد آید آب زلال
کشود لب بہ ثنایش رضا علی وحشت کہ اعتقاد قوی دارد او با ہل کمال

(دیوان وحشت ص ۱۳۴-۱۳۵، مطبوعہ ستارہ ہند، کلکتہ)

بانکی پور پٹنہ میں

۱۹۱۳ء کے اوائل میں علامہ شبلی نے پٹنہ سفر کیا اور انجمن اسلامیہ بانکی پور کی ایک تقریب میں شریک ہوئے۔ لیکن اس سے زیادہ اس سفر کی تفصیلات دستیاب نہیں۔ حتیٰ کہ تقریب کی صحیح تاریخ بھی معلوم نہیں ہوسکی۔ البتہ اس موقع پر پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی [۱۸۸۸-۱۹۷۷ء] نے جو خیر مقدمی نظم پیش کی تھی وہ ماہنامہ تمدن دہلی اپریل ۱۹۱۳ء میں شائع ہوئی ہے۔ اسی سے اس سفر کا علم ہوا۔ قدردانان شبلی کے لئے یہ نظم یہاں پیش کی جارہی ہے۔ اسے نقل کرنے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ماہنامہ تمدن کے شمارے علی العموم دستیاب نہیں ہیں اور پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی کے کلام کا ''رقص شرر'' کے نام سے کراچی سے جو انتخاب شائع ہوا ہے یہ نظم اس میں شامل نہیں ہے۔

نغمہ زن کیوں شاخ گل پر بلبل ناشاد ہے　　آج کیوں اجڑا ہوا اک گلستاں آباد ہے
پل رہا ہے پتا پتا ہے یہ جوش انبساط　　کس طرح تنتا اکڑتا باغ میں شمشاد ہے
نرگس بیمار بھی بشاش آتی ہے نظر　　بلبل ناشاد بھی دیکھو کہ کیسی شاد ہے
آمد آمد آج کس گل کی ہے کیسی دھوم ہے　　صحن گلشن میں یہ کیا شور مبارک باد ہے
مل گئی ہے کون سی ایسی تجھے دولت؟ بتا　　کیوں دماغ آج آسماں پر اے عظیم آباد ہے
کان دھرئے کیا صدا دیتی ہیں گا کر بلبلیں　　کہتے ہیں انداز غنچوں کے کہ کچھ ارشاد ہے
آج ہے اس کے قدم سے عزت اپنی خاک کو　　اس کے دم سے آج یہ اجڑا دیار آباد ہے
جو ہے باپ اردو ادب کا علم وفن کا سرپرست　　فارسی کی شاعری میں آج جو استاد ہے
جس کی تحریریں سند ہیں اک محقق کے لئے　　جس کی سٹائل مصنف کے لئے خیراد ہے
دھاک ہے تیغ قلم کی جس کی ملک علم میں　　فیصلوں پر جس کے دشمن دوست سب کا صاد ہے

اس کی کن کن خوبیوں کو ہم گنیں؟ کیا کیا کہیں
ہے بجا اس کو اگر ہم علم کا دیوتا کہیں (۱۴)

اس کے علاوہ بھی پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی نے اپنی بعض تخلیقات میں علامہ شبلی کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ راقم نے انہیں اپنی کتاب ''شبلی سخنوروں کی نظر میں'' یکجا کیا ہے۔ (۱۵)

تعلیقات وحواشی:

(۱) سفرنامہ روم ومصر وشام ص ۱۵۷

(۲) حیات شبلی ص ۲۶۹۔۲۷۰

(۳) حیات شبلی ص ۲۷۰

(۴) حیات شبلی ص ۲۷۰۔۲۷۱

(۵) حیات شبلی ص ۲۷۱

(۶) مثنوی صبح امید: علی گڑھ کے زمانہ میں سب سے پہلے ۱۸۸۵ء میں علامہ شبلی نے یہ مثنوی لکھی جو ۱۸۸۷ء میں شائع ہوئی۔ اس میں علی گڑھ اور سرسید کا ذکر ہے۔ کلیم الدین احمد نے اس مثنوی کی بے حد تعریف کی ہے۔

(۷) مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم: ایم اے او کالج علی گڑھ میں علامہ شبلی کا پہلا علمی کارنامہ، جس میں انہوں نے مسلمانوں کی تعلیم کی تاریخ بیان کی ہے اور دکھایا ہے کہ مسلمانوں نے تعلیم کے میدان میں کس قدر نمایاں خدمات انجام دیں۔ یہ اصلاً مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں پیش کیا گیا ایک خطبہ ہے۔ یہ علاحدہ بھی چھپا ہے اور مقالہ کی صورت میں مقالات شبلی میں بھی شامل ہے۔

(۸) المامون: خلیفہ مامون رشید کی مفصل سوانح عمری ہے۔ اس میں اس عہد کی پوری تاریخ بھی آ گئی ہے۔

(۹) سیرۃ النعمان: امام اعظم کی سوانح عمری ہے۔ ۱۸۸۹ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ ابتک پچاسوں اڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور دنیا کی مختلف زبانوں میں تراجم بھی ہو چکے ہیں۔ تفصیل کے لئے دیکھیں آثار شبلی اور تصانیف شبلی کے تراجم۔

(۱۰) کتب خانہ اسکندریہ: یورپ نے حضرت عمرؓ پر یہ الزام لگا رکھا تھا کہ انہوں نے اسکندریہ کا

کتب خانہ جلوا دیا تھا۔اس الزام کی تردید میں علامہ شبلی نے یہ تاریخی مقالہ لکھا اور ثابت کیا کہ یہ مسلمانوں پر محض ایک الزام ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اسے خود عیسائیوں نے جلایا اور برباد کیا اور اس کی بربادی میں ان کے پیشوا بھی شریک تھے۔اسے متعدد اداروں نے کتابی صورت میں شائع کیا اور مقالات شبلی میں بھی شامل ہے۔

(۱۱) جزیہ: جزیہ کو یورپ اور ان کے ہم نواؤں نے ایک ظالمانہ ٹیکس قرار دے کر مسلمانوں کو ظالم و جابر ثابت کیا تھا۔علامہ شبلی نے اس الزام کا بھی جائزہ لیا اور ثابت کیا کہ یہ ظالمانہ ٹیکس نہیں تھا، بلکہ غیر مسلموں کے حق میں رحمت تھا۔

(۱۲) حقوق الذمیین: اس مقالہ میں اسلام میں ذمیوں کے حقوق پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس سلسلہ کے الزامات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔یہ بھی مقالات شبلی میں شامل ہے۔

(۱۳) سفر روم ومصروشام: ۱۸۹۲ء میں علامہ شبلی نے مسلمانوں کے تعلیمی جائزے کے لئے روم و مصروشام کا جو سفر کیا تھا یہ اس کا سفر نامہ ہے۔متعدد بار شائع ہوا۔کئی زبانوں عربی، انگریزی اور ترکی میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

(۱۴) ماہنامہ تمدن، دہلی، اپریل ۱۹۱۳ء ص ۲۷

(۱۵) شبلی سخنوروں کی نظر میں ص ۱۴۷

◆◆◆

[۹]

رشید حسن خاں کا مطالعہ شبلی

رشید حسن خاں [۱۹۲۵-۲۰۰۶ء] ممتاز ترین محقق و نقاد تھے۔ تحقیق اور خاص طور پر متنی تحقیق کے میدان میں انھوں نے جو کاوشیں کی ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں اور جو تاریخ ادب اردو میں سنہرے حرفوں میں لکھی جائیں گی۔ حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود، امتیاز علی عرشی کو وہ اپنا معنوی استاذ تسلیم کرتے تھے اور انھیں کے نہج پر وہ تحقیقات کا آغاز کرتے ہیں، مگر سچ یہ ہے کہ متنی تحقیق میں رشید حسن خاں صاحب اس بلند مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں ان کے معنوی اساتذہ نہ پہنچ سکے تھے۔

رشید حسن خاں نے علامہ شبلی کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ ادبی زندگی کے آغاز اور پچیس سال کی عمر میں انھوں نے شبلی کی فارسی شاعری کا بڑی گہرائی اور باریک بینی سے جائزہ لیا تھا جو مئی ۱۹۵۰ء کے نگار میں 'شبلی کا فارسی تغزل' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے قدرے تفصیل سے شبلی کے جذبات اور احساسات کا تجزیہ کیا ہے اور کئی اور نقادوں کی طرح ان کی شاعری کو حافظ و سعدی سے جاملایا ہے۔ ان کے شاعرانہ جذبات کے مطالعہ میں وہ بھی بمبئی پہنچے ہیں، لیکن دادِ سخن دی ہے اوروں کی طرح بات سے بات پیدا نہیں کی ہے، اپنے وسیع و عمیق مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ

> ''شبلی اپنے رنگ کے بے مثل فنکار ہیں۔ انھوں نے اپنے اشعار میں احساسات و جذبات کی بے لاگ تصویریں پیش کی ہیں۔ ایسی تصویریں جو حسین ترین رنگوں سے مزین ہیں اور جن کے امتزاج میں انھوں نے اس

مذاق سلیم کا ثبوت دیا ہے جو کم دیکھنے میں آتا ہے۔ آپ پورا مجموعہ فارسی غزلیات کا پڑھ جایئے ایک شعر میں بھی اس حدیث شوق کے علاوہ کسی دوسری بات کا بیان نہیں ہوگا۔ یہی بات ان کے مذاق سلیم کی سب سے بڑی خوبی ہے''۔(مقالات رشید خاں جلد اول ص ۶۷)

یہ مضمون بیسویں صدی کی پانچویں دہائی کے آغاز میں شائع ہوا۔ پھر خاں صاحب نے بیس سال بعد علامہ شبلی کے مضامین کا انتخاب اس وقت کیا جب وہ ایک ممتاز متنی محقق کی حیثیت سے تسلیم کئے جا چکے تھے۔ انتخاب مضامین شبلی ۱۹۷۱ء میں مکتبہ جامعہ دہلی نے شائع کیا۔ یہیں سے ۱۹۹۳ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن طبع ہوا جو راقم کے پیش نظر ہے۔ اب اس کا تیسرا ایڈیشن بھی شائع ہو گیا ہے۔

موازنہ کے متعدد محقق ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ رشید حسن خاں نے بھی اسے مرتب کیا ہے، جس کا ذکر راقم کی کتاب ''آثار شبلی'' میں شامل ہے۔ یہاں اس کے تعارف و تجزیئے کی تفصیلات سے صرف کرتے ہوئے محض رشید حسن خاں کے دیباچہ کے مشمولات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ خان صاحب علامہ شبلی کی جامعیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی کے متعلق یہ بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ وہ مختلف موضوعات پر یکساں دسترس رکھتے تھے، مستقل تصنیفات کے علاوہ ان کے مختلف مضامین کے مجموعے بھی اس پر گواہ ہیں۔ سیرت، سوانح، تنقید اور معقولات پر ان کی تصنیفات معروف ہیں، لیکن مضامین کے مجموعوں میں ان کے موضوعات کا دائرہ وسیع تر نظر آتا ہے، مذہبیات اور اردو ہندی کی بحث، عربی کے نصاب کے مسائل، اسلامی تہذیب کے اہم عنوانات، قرآن پاک کے متعلق فکر انگیز مقالے، قدیم کتابوں پر مختصر اور مفصل تبصرے، ادبی مباحث مستشرقین کی غلط کاریوں کی تردید، سیاسی افکار، غرض بیسیوں اہم موضوعات پر بحث کی گئی ہے، اور ہر جگہ ان کے مخصوص انداز تحریر کی روشنی پھیلی ہوئی ہے۔

ان مضامین کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ کس قدر وسیع تھا، ذہن کس درجہ پر نکتہ رس تھا، نظر کیسی باریک تھی اور قلم میں کس قیامت کی توانائی تھی''۔

(تعارف، موازنہ انیس ودبیر ص ۵)

علامہ شبلی کی شخصیت کا ایک اہم پہلو قدیم صالح اور جدید نافع کا امتزاج ہے۔ وہ اپنے عہد میں اس کے سب سے بڑے علمبردار تھے اور ابتداء سے تھے، علی گڑھ پہنچنے کے بعد ہی ان کی تحریروں میں اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ علی گڑھ سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا لیکن علی گڑھ تحریک نے بھی ان سے بہت کچھ حاصل کیا، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، تاہم ان کا یہی ارتقائی نظریہ ان کی علی گڑھ تحریک سے سولہ سالہ وابستگی کے باوجود انحراف کا باعث ہوا اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے تحریک ندوہ میں شمولیت اختیار کی اور یہی وجہ ہے کہ اخیر تک ان کا رشتہ علی گڑھ سے بھی قائم اور استوار رہا۔ اور اسی وجہ سے قدامت پرستوں نے ان پر کفر کے فتوے لگائے۔ رشید حسن خاں اس امتزاج کو شبلی کا بڑا کارنامہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شبلی کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے قدیم وجدید کے قصے کو اپنے ذہن پر حاوی ہونے نہیں دیا۔ وہ قدیم کی عظمت کے قائل تھے لیکن اس کی کمزوریوں سے بھی باخبر تھے اور معترف بھی۔ وہ جدید کی اہمیت کو پوری طرح مانتے تھے لیکن اس سے مرعوب نہیں تھے۔ آج شاید اس بات کی اہمیت کا اندازہ نہیں کیا جاسکے گا، لیکن شبلی کے زمانے میں اس توازن کی بڑی ضرورت تھی''۔ (ایضاً ص ۵۔۶)

اس کے بعد رشید حسن خاں نے علامہ شبلی کے عہد پر روشنی ڈالی ہے۔ قدامت پرستوں کی کمزوریوں اور جدید ذہن اور مغربیت کے سیلاب کا ذکر کیا ہے اور تفصیل سے بتایا ہے کہ ہمارے علماء کا کیا معیار تھا؟ معاشرے کا کیا حال تھا؟ مشنریاں کیا کررہی تھیں؟ ایسے غیر معتدل ماحول میں شبلی نے توازن پیدا کرنے کی کوشش کی، وہ لکھتے ہیں

''ایسے زمانے میں جب کہ یا تو مسائل سے بے تعلقی تھی یا تعلق تھا تو توازن کا

پہلو دب گیا تھا، شبلی نے مذہبی مسائل اور سیاسی امور دونوں میں وہ انداز اختیار کیا جس میں توازن کا پہلو نمایاں تھا، وہ سرسید سے بہت متاثر تھے، ان سے بہت کچھ سیکھا بھی تھا، اس کے معترف بھی تھے، لیکن بہت سے سیاسی اور مذہبی مسائل میں ان سے سخت اختلاف رکھتے تھے، وہ مستشرقین کے اعتراضات کا جواب دیتے جاتے ہیں، لیکن یورپ کی علمی فیض بخشیوں اور اس کے احسانات کا اقرار بھی کرتے جاتے ہیں، وہ جدید تعلیم کی سطحیت سے خوش نہیں لیکن قدیم تعلیم کی عدم افادیت کے بھی اسی طرح قائل ہیں اور ندوے میں اس حد تک اصلاح کرنے کے درپے تھے جس کو پرانے خیال کے علماء برداشت نہیں کر سکے''۔(ایضاص ۷)

اس کی اور بھی تفصیل انھوں نے لکھی ہے۔علامہ شبلی کی وسعت ذہنی اور وسعت قلبی کا بھی ذکر کیا ہے اور قدیم وجدید کے سلسلہ میں ان کے نقطہ کی بھی وضاحت ہے۔اس تجزیے کے بعد انہوں نے لکھا ہے کہ

''اصلاح کا یہ جذبہ اور صاف گوئی کا یہ انداز شبلی کا قابل قدر عطیہ ہے جو انھوں نے اس زمانے میں نئی نسل کو بخشا، ان کے مضامین میں یہ سارے مباحث ومسائل محفوظ ہیں اور اسی لئے ان کے مضامین کی بڑی اہمیت ہے''۔(ص ۸)

اور اسی اہمیت کے پیش نظر انھوں نے ''انتخاب مضامین شبلی'' کو مرتب کیا ہے۔اس کے بعد انھوں نے علامہ شبلی کی انشا پردازی کا ذکر کیا ہے اور اسے ایک مسلمہ اور متفق علیہ مسئلہ بتایا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ وہ صاحب طرز انشا پرداز تھے۔پھر انھوں نے معاصرین شبلی کے اسالیب بیان کی توضیح کے ساتھ اس میں شبلی کی انفرادیت کا ذکر کیا ہے، انہوں نے یہ نکتہ بھی اٹھایا ہے کہ اسلوب شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔اس نقطہ نظر سے علامہ شبلی کے اسلوب اور ان کی شخصیت کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

''ان کی شخصیت کثیر الجہات تھی، سیاست، ادب، مذہب، تاریخ، فلسفہ وغیرہ

> بہت سے اطراف وموضوعات ان کی جولان گاہ تھے۔ وہ مولوی تھے، استاذ تھے، سیاسی مسائل سے بھی تعلق رکھتے تھے اور شاعر بھی تھے۔ ان کی سوانح کا سرسری مطالعہ بھی اس بات کی تعیین کے لئے کافی ہوگا کہ پر جوش جذباتیت ان کے مزاج کا غالب عنصر تھا اور اس کے اثرات بھی نمایاں ہوتے رہتے تھے۔ ادب میں ہی نہیں عام زندگی میں بھی، مثلاً وہ سردیوں میں بھی بہت تیز برف کا پانی پینا پسند کرتے تھے اور شیرینی اس قدر زیادہ مرغوب تھی کہ میٹھی سے میٹھی چیز بھی کچھ کم میٹھی معلوم ہوتی تھی۔ (ایضاص۹)

اس تجزیے سے انھوں نے شبلی کی انتہا پسندی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور ''حیات جاوید'' کا پرانا قصہ بیان کیا ہے۔ حالانکہ اس وقت آل احمد سرور تجزیہ کر کے لکھ چکے تھے کہ شبلی کو مصور پسند تھا، اس کی بنائی ہوئی ایک تصویر پسند نہ تھی۔ لیکن رشید حسن خاں کی اس بات میں وزن ہے کہ ''حیات جاوید'' کی ہیرو پرستی سے نالاں شبلی خود بھی تو شخصیت بلکہ عظمت وسطوت کے خوگر ہیں، لیکن پھر وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ

> ''شبلی کی شخصیت اس لحاظ سے بہت دلچسپ ہے کہ وہ قدیم وجدید دونوں کی انتہا پسندیوں سے بیزار ہیں، تنگ نظری کے دشمن ہیں اور منطقیت کو تحریر وتقریر دونوں کے لئے ضروری سمجھتے ہیں''۔ (ایضاص۱۰)

علامہ شبلی کی رومانیت کو سمجھنے کی صحیح کوشش اب تک نہیں کی گئی تھی اور جن لوگوں نے اس پر قلم اٹھایا انھوں نے اسے بمبئی کے دلفریب مناظر میں تلاش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ شبلی کے رومان کو صحیح طور پر سمجھا نہیں جاسکا۔ رشید حسن خاں نے اس کی تشریح اس طرح کی ہے:

> ''رومانیت شبلی کے مزاج کا بنیادی عنصر تھی، اس سے شگفتگی کے پھول کھلتے ہیں اور مشتعل طبیعت کی آنچ بھی حرارت کو بکھیرتی ہے، اس عالم میں ان کا قلم تحریر کے ایسے پھول کھلاتا ہے جن میں شراروں کی نہیں شعلوں کی گرمی اور چمک ہوتی ہے، یہ کیفیت ان پر اس وقت خاص طور پر طاری ہوتی ہے جب وہ کسی

ایسے معترض کے اعتراضات کا جواب دے رہے ہوں جس نے اسلامیات سے متعلق کسی مسئلے پر یا تاریخ اسلام کے کسی دور یا فرد پر نکتہ چینی کی ہو، وہ حوالوں سے اپنی بات کو مستند کرتے جاتے ہیں اور ادبیت میں ڈوبے ہوئے اور ترشے ہوئے جملوں سے جلالی کیفیت کا اظہار کرتے جاتے ہیں، جوش بیان اور حسن انشا پردازی کے لحاظ سے ایسے مقامات لائق ذکر بھی ہیں اور قابل رشک بھی۔'' (ایضاص۱۱)

پھر خاں صاحب نے اس کی مثالیں درج کی ہیں اور ایسی عمدہ مثالیں دی ہیں کہ ذوق و وجدان کو متاثر کر دیتی ہیں۔ بعدازاں انھوں نے علامہ شبلی کی عظمت اور ان کی بالغ نظری کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ

''شبلی کے یہاں اپنے طبقے کی روایت کے برخلاف وسعت فکر ونظر کی جو طاقت پائی جاتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عربی کی جدید ترین مطبوعات سے برابر استفادہ کرتے رہتے تھے، وہ کوشش کرتے تھے کہ یورپ کی اہم کتابوں سے بھی کسی واسطے سے استفادہ کیا جائے، ان کو سیاسی مسائل سے بھی لگاؤ تھا۔ ملک میں سیاسی تحریکیں چل رہی تھیں وہ ان میں بھی کچھ نہ کچھ حصہ لیتے رہتے تھے، انھوں نے اسلامی تاریخ کا بڑی توجہ سے مطالعہ کیا تھا اور فلسفے سے ان کو ربط خاص تھا جس نے ان کے اندر تنگ نظری کو شروع ہی سے پیدا ہونے نہیں دیا۔'' (ایضاص۱۲۔۱۳)

رشید حسن خاں شبلی کی عظمت وجامعیت اور بالغ نظر کے تو مداح ہیں ہی ان کے حسن انشا کے بھی بڑے مداح ہیں، ان کی خوش مذاقی اور شاعرانہ کمالات کا اعتراف بھی بڑے ادبی انداز میں کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''خوش مذاقی اکتسابی چیز نہیں۔ یہ حصہ جس کو ملا، مل گیا۔ شبلی کی تحریر میں سخن فہمی، شاعری اور زندگی میں بھی خوش مذاقی ان کی شریک غالب رہی ہے، فارسی کی

غزلوں کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ آخر دور اکبری کا طوطی خوش نوا بول رہا ہے۔ یا
نظیری وعرفی کے قبیلے یا جماعت کا کوئی فرد، اسی کا اثر تھا کہ ان کی تحریروں
میں بلا کا حسن ہے۔انشا پردازی جس چیز کا نام ہے وہ واقعۂ شبلی کا حصہ ہے۔
ایسے شگفتہ اور ترشے ہوئے جملے لکھتے ہیں جن میں شاعری کا سارا حسن سمٹ
آتا ہے۔''

یہی وہ انداز فکر اور انداز نگارش ہے جس نے شبلی کو ان کے طبقے سے
نکال کر اس جماعت کی صف اول میں بیٹھا دیا ہے جہاں کے بیٹھنے والے خوش
مذاقی، احساس جمالیات اور حسن سے وہ جہاں بھی ہوں اور جس عالم میں بھی
ہوں ربط خاص رکھتے ہیں۔'' (ایضاص ۱۳۔۱۴)

پھر خاں صاحب علامہ شبلی کی جذباتیت اور رومانیت کو ان کی کمزوری بھی بتاتے ہیں اور یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ کبھی کبھی خوش بیانی میں وہ منطق کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، وہ یہ بھی کہتے ہیں ''شعر العجم ''اسی کمزوری کا شکار ہوئی، وہ یہ بھی مثال میں پیش کرتے ہیں کہ ایک جگہ کہتے ہیں کہ بنوامیہ نے آزادی کا گلا گھونٹ دیا مگر جرجی زیدان کی تنقیدوں کا جب جواب دیتے ہیں تو بنو امیہ کی حمایت کرتے ہیں۔ (ص ۱۴)

ان کا یہ بھی خیال ہے کہ وہ دعوی بہت کرتے ہیں۔ اس دعوے کی مثالیں بھی رشید حسن خاں نے دی ہیں۔ اسی بنا پر وہ علامہ شبلی کو محقق سے زیادہ انشا پرداز قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تحقیق خارا شگافی اور کافر طبیعتی کی طلب گار ہے اور زود یقینی اور رنگینی کی دشمن، جو شبلی کی طبیعت سے میل نہیں کھاتی، (ص ۱۵) اس لئے ان کی تحریروں کو پڑھتے ہوئے مذکورہ باتوں کا خیال رکھنا چاہئے۔

۱۹۸۰ء میں پٹنہ کے ایک سمینار منعقدہ بہار اردو اکیڈمی پٹنہ میں رشید حسن خاں نے حافظ محمود خاں شیرانی پر مقالہ پیش کیا، عنوان تھا'' شیرانی کی تاریخی اہمیت''اس میں انھوں نے شیرانی کو تحقیق کا معلم اول قرار دیا ہے۔ (ص ۵۳۲)

پھران سے پہلے کے عہد سرسید کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ان کا خیال ہے کہ سرسید تحریک کا اثر تیس برس رہا،اس دور میں سرسید اور ڈپٹی نذیر احمد کی غیر جذباتی نثر کے مقابلہ شبلی وآزاد کی نثر کو زیادہ مقبولیت ملی،انداز فکر میں بھی اور پیرایہ بیان میں بھی۔وہ لکھتے ہیں۔

''شعریت اور جذباتیت کے مارے ذہنوں کو سادگی اور متانت غیر مانوس معلوم ہوتی تھی۔حالی کی سادہ وصاف نثر ابالی کھچڑی کی طرح بے مزہ لگتی تھی۔ شہرہ تھا شبلی وآزاد کی نثر کا،جس میں ذہنوں کو متاثر کرنے کی ایسی صلاحیت تھی اور ہے کہ آدمی کچھ دیر کے لئے ساری منطق بھول جاتا ہے۔............شبلی کا مشتعل اور ادیبانہ لہجہ اور پرزور جذباتی انداز استدلال ذہنوں کو زیادہ متاثر کرتا ہے۔''(ایضاً ص۵۳۳)

رشید حسن خاں کا خیال ہے کہ حالی،شبلی وآزاد کا دور جذباتیت کا دور تھا۔یہی وجہ ہے کہ اس دور میں انشاء پردازوں کو محققین کے مقابلے میں زیادہ مقبولیت ملی۔حافظ محمود شیرانی کی ''تنقید شعر العجم'' کے خلاف جو آوازیں بلند ہوئیں،اس کو وہ اس دور کی فضا کا ردعمل قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے اس مضمون میں یہ بات پھر دہرائی ہے کہ شبلی حالی اور آزاد میں کسی میں وہ مزاج نہیں پایا جاتا جس کو تحقیق کہتے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

''حالی کی سلامت روی، وضع داری اور عفو ودرگذر کی پاکیزہ خصلت تحقیق کی کافر طبیعتی اور بے رحمی کی حریف نہیں ہوسکتی۔شبلی کی بے کراں اور بے اماں جذباتی طبیعت ، ہیرو پرستی اور ان کا خطیبانہ اور مجاہدانہ انداز بیان ،منطقی استدلال تحقیق پسندی سے میل نہیں کھاتا،شبلی عالم تھے۔بہت ذہین بڑے سخن فہم اور بہت بڑے انشاء پرداز تھے۔ان کی بے مثال خوبیوں کا انکار مقصود نہیں لیکن وہ بھی حالی کی طرف محقق نہیں تھے۔ان کے مزاج کو تحقیق کے غیر جذباتی عمل سے مناسبت نہیں تھی۔ جذباتیت منطق کی دشمن ہے اور انشاپردازی حقیقت بیانی کی حریف ہے۔''(ص۵۳۵)

یہ تجزیہ اور یہ پس منظر دراصل حافظ محمد شیرانی کی تحقیقات کی اہمیت واضح کرنے کے لئے پیش کیا گیا ہے، اس تجزیہ میں کئی باتوں میں خاں صاحب سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، خاں صاحب جب حافظ محمود شیرانی کے مزاج کی تحقیق اور ان کے اسلوب کا ذکر کرتے ہیں یا پھر ان کی تحقیقات کی داد دیتے ہیں تو انھیں یاد آ جاتا ہے کہ شیرانی صاحب نے بھی اپنی تحقیقات میں کہیں کہیں انشا پردازی کی ہے، وہ دیانت دار تجزیہ نگار کی طرح اس کمی ک اعتراف کر لیتے ہیں، بلاشبہ یہ ان کی دیانت دارانہ عظمت ہے مگر انصاف نہیں، ان کا یہ بھی خیال ہے کہ شیرانی اپنی تحقیق کے اصولوں کا ذکر نہیں کرتے۔ اس کے باوجود ان کی تحقیقات پر حرف نہیں آتا۔ یہاں یہ بات کہنے کو جی چاہتا ہے کہ شبلی کی محققانہ حیثیت سے غالباً خاں صاحب پوری طرح واقف نہیں تھے مثلاً انھوں نے ''المامون'' میں ''الفاروق'' میں، ''الغزالی'' میں اور'' سوانح مولانا روم'' میں جس محققانہ انداز کو اختیار کیا ہے اور جو تحقیقات پیش کی ہیں خاص طور پر تحقیق منسوبات میں وہ اپنے عہد کی ممتاز محقق ہیں۔ پھر خاں صاحب ذہن ومزاج کی بات اٹھاتے ہیں۔ شبلی نے روایت ودرایت، اصول استنباط نتائج اور حوالہ وغیرہ کا جس طرح اہتمام کیا ہے اور ان تحقیقی اصولوں کی پاسداری کی ہے کم از کم ان کے عہد میں تو اس کی مثال نہیں ملتی، دراصل خاں صاحب کے پیش نظر محض ''شعرالعجم'' کے وہ مباحث تھے جو شیرانی صاحب نے تنقید شعرالعجم میں پیش کئے تھے، بنظر غائر دیکھا جائے تو شبلی کے یہاں تحقیق کے ابتدائی اور بنیادی عناصر موجود ہیں، ہمارے نقادوں کی نظر شعرالعجم اور موازنہ پر جا کر اٹک جاتی ہے اور المامون، الفاروق اور سوانح مولانا روم کی تحقیقات بلکہ جزیہ، کتب خانہ اسکندریہ اور اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر کو مذہبی اور تاریخی تحقیقات کہہ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان کا یہی صرف نظر انھیں حقیقت سے آشکارا ہونے میں سدراہ رہا۔

رشید حسن خاں نے ''تنقید شعرالعجم'' پر روشنی ڈالی ہے، جس میں وہ حافظ محمود شیرانی کے طرف دار نظر آتے ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

> ''تنقید شعرالعجم کے عنوان سے اکتوبر ۱۹۲۲ء سے جنوری ۱۹۲۷ء تک جو سلسلہ مضامین شائع ہوا، دراصل اس نے ذہنوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور علمی دنیا میں

شدید ردعمل کا آغاز ہوا۔ ردعمل کی شدت اس پر گواہ تھی کہ عقیدت مندی اور
شخصیت پرستی کے جذبے کو ٹھیس لگی ہے۔ روایت درست ذہن نے جس کی
اس زمانے میں حکومت تھی یہ محسوس کیا کہ یہ منفی انداز نظر ہے اور حد ادب کی
خلاف ورزی ہے۔ جذباتی روایت پرستی نے یہ بات ذہن نشیں نہیں ہونے دی
کہ یہ صداقت کی تلاش اور کھرے کھوٹے کی پرکھ ہے۔'' (ص ۵۳۸)

بلاشبہ صداقت کی تلاش اور کھرے کھوٹے کی پرکھ پر قدغن نہیں لگائی جا سکتی مگر کسی تنقید سے کوئی شخصیت زد میں آئے تو گویا اس پر نقد نہیں کہا جا سکتا، اگر چہ جو نقد کیا گیا ہے وہ صحیح ہی کیوں نہ ہو، شخصیت پرستی کے ضمن میں آ جائے گا جس کی خاں صاحب کے یہاں اجازت نہیں گویا کسی شخص پر اگر کسی نے قلم اٹھایا تو بہر حال خاموش رہنا ہوگا۔ تحقیق و تنقید کے میدان میں یہ اصول ہی کسی طور جائز نہیں قرار دیا جا سکتا۔ ''تنقید شعر العجم'' کے خلاف بلاشبہہ شدید ردعمل ہوا۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ شیرانی صاحب نے ایک دو برس نہیں پورے پانچ برس ''شعر العجم'' اور شبلی کو تختۂ مشق بنائے رکھا۔ پھر اسے تنقید کا نام کیوں دیا گیا۔ اسے تصحیحات ''شعر العجم'' کا نام بھی دیا جا سکتا تھا۔ یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ تنقید شعر العجم سے پہلے کئی تنقیدیں شائع ہو چکی تھیں۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے بھی اس پر تنقید لکھی تھی۔ البتہ ان کا لہجہ انتہائی متانت آمیز ہے اور استاذ کے ساتھ یہی اسلوب ہونا بھی چاہئے، مگر حافظ اسلم جیراج پوری نے حافظ محمود شیرانی سے دس سال پہلے ''شعر العجم'' پر سخت تنقیدی مضمون لکھا بلکہ علامہ شبلی کی زندگی میں لکھا۔ وہ عربی کے ساتھ فارسی شعر وادب اور تحقیق و تنقید کے مرد میداں تھے۔ ان کی تحقیقات سے اہل علم واقف ہیں۔ انھیں تحقیق کا معلم اول کا درجہ کیوں نہ دیا جائے اور ان کی ''تنقید شعر العجم'' کو اتنی اہمیت کیوں نہیں دی گئی۔ ایسا سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ رشید حسن خاں جیسے دیدہ ور محقق مولانا اسلم جیراج پوری اور ان کی تنقیدات سے ناواقف رہے ہوں گے۔ دراصل ردعمل کی اصل وجہ شیرانی صاحب کی پشت پناہی کر رہے بابائے اردو مولوی عبدالحق کی وجہ سے تھے، جنھوں نے علامہ شبلی کے ہر کام میں کیڑا نکالنا جو اگر چہ ان کے شان متانت اور مرتبہ کے خلاف تھا، تاہم اسے انھوں نے اسے اپنا وطیرہ بنا

لیا تھا۔

آخر میں انھوں نے حافظ محمود شیرانی کی کتاب ''پنجاب میں اردو'' پر تبصرہ کیا ہے اور ان میں تقریباً انھیں غلطیوں کی نشاندہی کی ہے جو ان سے پہلے کے محققین سے سرزد ہوئی تھی۔ اس میں خاص طور پر انھوں نے طے شدہ نظریہ کی بات کہی ہے اور درحقیقت تحقیق کوئی طے شدہ بات نہیں ہوتی۔ رشید حسن خاں نے تو یہ بات نہیں لکھی، مگر حقیقت یہی ہے کہ ''تنقید شعر العجم'' میں اسی کمزوری کی وجہ سے شدید ردعمل ہوا تھا۔ آخر میں رشید حسن خاں نے بڑی سچی بات کہی ہے کہ

> ''قابل اعتراض نا قابل قبول بات جو بھی کہے وہ مولانا شبلی ہوں یا حافظ محمود شیرانی اس کو واضح طور پر رد کرنا اور افادیت کو برقرار نہیں رکھ پائے گا۔'' (ایضاً ص ۵۴۱)

۱۹۸۲ء میں رشید حسن خان نے موازنہ انیس و دبیر کو مرتب کیا جسے مکتبہ جامعہ دہلی نے شائع کیا، یہ شبلی کے حوالہ سے ان کا دوسرا ادبی کام تھا، رشید حسن خاں صاحب ہمارے عہد کے سب سے بڑے محقق و مدون تھے، انھوں نے خاص طور پر متنی تحقیق میں جو کاوشیں کی ہیں امید نہیں کہ برسوں کوئی ان کا ہم سر پیدا ہوگا۔ لیکن موازنہ انیس و دبیر میں انھوں نے اپنا حق ادا نہیں کیا۔ وہ موازنہ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> ''موازنہ انیس و دبیر پہلی بار ۱۹۰۷ء میں مطبع مفید عام آگرہ سے شائع ہوا تھا، نسخہ جامعہ کی بنیاد اسی ایڈیشن پر رکھی گئی ہے، اصل نسخے میں اشعار کا متن متعدد جگہ مشکوک معلوم ہوتا ہے لیکن اس میں کوئی تصرف نہیں کیا گیا ہے۔
>
> اشاعت اول کے سرورق پر کتاب اور مؤلف کا نام اور کتاب سے متعلق جو عبارت چھپی ہوئی ہے اس نسخے کے اندرونی سرورق پر اس کو بلفظہ نقل کر دیا گیا ہے''۔ (تعارف موازنہ انیس و دبیر ص ۸)

متنی تحقیق سے اس قدر بے اعتنائی تو شاید ہی انھوں نے اپنی کسی اور مدونہ کتاب میں ہوگی۔ بہر حال ان کی بدولت مکتبہ جامعہ کا ایڈیشن شائع ہوا اور اب تک اس کے تین ایڈیشن طبع

ہو چکے ہیں، تاہم انھوں نے موازنہ پر اظہار خیال ضرور کیا ہے۔ چند صفحے کے تعارف میں موازنہ اوراس کے مصنف کا ذکر بڑے مؤثر طریقے سے کیا گیا ہے۔ شبلی کی عظمت و جامعیت اورادب و انشاء کے بارے میں جن خیالات کا ''انتخاب مضامین شبلی'' کے تعارف میں کیا گیا تھااس میں بھی اس کی بازگشت صاف سنائی دیتی ہے۔ البتہ اس ضمن میں شبلی کی بعض انفرادیت جس کا ذکر انتخاب میں نہ آسکا تھااس میں بیان کردیا ہے، مثلاً وہ لکھتے ہیں:

> ''شبلی کے مزاج میں احساس تناسب بلا کا تھااوران کا اسلوب تحریر اس کا آئینہ ہے۔ علمیت، وقار، بلند آہنگی اور جوش بیان کے اجزا، زبان کی صفائی، سلامت اور شستگی میں اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ خالص علمی انداز بیان کے باوجود ان کی زبان علمیت کے بوجھ سے دہری نہیں ہوتی، ان کی تنقید میں بھی اسی شائستگی کی جلوہ گری نظر آتی ہے۔'' (تعارف ص ۵)

علامہ شبلی نے موازنہ میں اپنے موقف کی تائید میں کثرت سے اشعار نقل کئے ہیں، یہ انتخاب بھی دراصل ذوقی معاملہ ہے۔ علامہ شبلی کے بلند ادبی ذوق کا کون معترف نہ ہوگا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ

> ''اچھے اشعار کے انتخاب اور ان کے محاسن کی مختصر لیکن جامع وضاحت میں بہت کم لوگ ان کے حریف قرار دیئے جاسکتے ہیں۔ حیرت انگیز جامعیت کے ساتھ ان کی نگاہ انتخاب ایسے اشعار اور ایسے اجزا کو منتخب کرلیتی ہے جو کسی شاعر کا حقیقی سرمایہ کمال ہوتے ہیں اوران کی خصوصیات کو اس خوش سلیقگی کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والا اس شاعر کے ساتھ ساتھ خود شاعری سے اپنے آپ کو قریب تر محسوس کرتا ہے۔'' (ایضاص ٦)

رشید حسن خاں نے شبلی کے نہ صرف ذوق انتخاب کی داد دی ہے بلکہ ہماری ادبی زندگی پر اس کے جو اثرات مرتب ہوئے، ان کی بھی نشاندہی کی ہے، یہی نہیں ان کے نزدیک میر انیس کی مقبولیت کا راز بھی اسی کتاب سے وابستہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ واقعہ ہے کہ شبلی کے حسن انتخاب اوران کے بے مثال اندازتشریح نے بے شمار لوگوں کے ذوق سخن اور ذوق انتخاب کی تربیت کی ہے، شعرالعجم اورموازنہ انیس ودبیر کو جن لوگوں نے دل لگا کر اورنظر جما کر پڑھا ہے وہ اس کی گواہی دیں گے۔موازنہ میں انیس کے محاسن شاعری کے ذیل میں انھوں نے جو طویل اورمختصر مثالیں درج کی ہیں بعد کے اکثر لکھنے والے ان پر بہت کم اضافہ کرسکے ہیں۔اور بہتوں نے تو انہی کی تکرار کی ہے۔اب تک انصاف کے ساتھ اس کا اعتراف نہیں کیا گیا کہ خالص شاعرانہ حیثیت سے انیس کے کلام وکمال کی جو شہرت ہے اس میں شبلی کی تصنیف موازنہ انیس ودبیر کا کتنا حصہ ہے۔میر انیس کے کمال شاعری کے قائل سب ہیں، لیکن بہت کم لوگوں نے مراثی انیس کی جلدیں پڑھی ہوں گی، اگر یہ کہا جائے کہ اس قبول عام میں شبلی کی اس تصنیف کا بہت بڑا حصہ ہے تو اس میں مبالغہ نہیں ہوگا۔''

(ایضاص۶)

اس اعتراف کمال کے بعد رشید حسن خاں نے علامہ شبلی کی زندگی کا مرقع پیش کیا ہے۔ انتہائی اختصار کے ساتھ نام، بچپن کا نام اور تاریخ پیدائش مئی ۱۸۵۷ء۔وفات ۱۹۱۴، تحصیل علم، علی گڑھ کی ملازمت، سرسید سے استفادہ، جدید تحقیقات سے آگاہی، وغیرہ حالات وواقعات اور بعض افکار مثلاً وہ جدید کی اہمیت کے قائل تھے مگر سرسید کی مذہبی اور سیاسی فکر سے اختلاف رکھتے تھے۔اورآخری بات بڑے پتے کی لکھی ہے کہ ان کی قدیم وجدید کی آویزش سے قدیم وجدید دونوں طبقے خوش نہیں رہے اوران کی زندگی کا ایک بڑا حصہ اسی آویزش کی کہانی ہے۔

شبلی کی زندگی کے اس حصہ کو بیان کرنے میں رشید حسن خاں نے بڑے اختصار سے کام لیا ہے، سبب جو بھی رہا ہو مگر یہاں وہ اپنے بلند معیار تحقیق سے فروتر ہو کر گذر گئے ہیں۔یہاں تک کہ شبلی کی تاریخ پیدائش جو حیات شبلی میں لکھی ہے اسی کو نقل کردیا ہے حالانکہ اس پر اس سے پہلے بحث وتحقیق ہو کر یہ طے ہو چکا تھا کہ شبلی کی تاریخ پیدائش مئی ۱۸۵۷ء نہیں بلکہ ۳؍جون ۱۸۵۷ء

ہے اور اب یہ تحقیق بھی پروفیسر اشتیاق احمد ظلی کی تحقیق سے کالعدم ہو کر ۴؍جون ۱۸۵۷ء ثابت ہو چکی ہے، خاں صاحب ذرا توجہ دیتے تو شاید کوئی تحقیق سامنے آتی۔

انتخاب مضامین شبلی میں وہ شبلی کی انشاء پردازی کی داد دے چکے ہیں مگر اس میں ایک قدم اور آگے بڑھ کر ان کے ہم عصروں سے موازنہ بھی کرتے ہیں اور ان پر شبلی کی برتری ثابت کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''انشاء پرداز کی حیثیت سے شبلی کا مرتبہ اپنے معاصرین میں نہایت ممتاز ہے۔ ان کے یہاں نہ تو وہ سادگی ہے جس پر ''ابالی کھچڑی'' کی پھبتی کسی جاسکی اور نہ وہ رنگینی ہے جو تاریخ کو افسانہ بنا دیا کرتی ہے۔ ان کی عبارت میں ان کی شخصیت کی طرح پرشکوہ، بلند آہنگی اور پروقار دل کشی ہے۔ یہ زبان علمی زبان ہے، لیکن شگفتگی آمیز ہے۔'' (ایضاً ص ۷)

رشید حسن خاں موازنہ کے بڑے مداح ہیں، خاص طور پر اس کے تنقیدی مباحث کے، اسے وہ ایک منفرد کتاب بتاتے ہیں اور اس کی کئی تنقیدی بحثوں کو تنقید کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ علامہ شبلی انتہائی صفائی کے ساتھ یہ اقرار کرتے ہیں کہ میر انیس کے مقابلہ میں مرزا دبیر کا نام لینا گویا بدمذاقی ہے، پھر وہ لکھتے ہیں:

''اس کتاب کا بڑا حصہ موازنے کے بجائے میر انیس کے کمال شاعری کا مرقع ہے جس زمانے میں یہ کتاب شائع ہوئی تھی اس زمانے میں اس کی مخالفت کا خاصا زور وشور رہا تھا اور الزام یہی تھا کہ شبلی نے انصاف سے کام نہیں لیا ہے، اس کی رد میں کئی کتابیں لکھی گئیں، آج وہ کتابیں خاص خاص کتاب خانوں کے سوا اور کہیں نہیں دکھائی دیتیں۔ زمانہ سب سے بڑا منصف ہے۔''

(ایضاً ص ۷۔۸)

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف علامہ شبلی کے ہم نوا ہیں بلکہ ان کے پرستار بھی ہیں۔ مخالفت میں لکھی جانے والی کتابوں کا ذکر بھی وہ بڑے سرسری انداز میں کرتے

ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اس سلسلہ میں علامہ شبلی پر عائد اعتراضات سے بھی بحث کرتے ہیں اور پھر مدلل مداحی کرتے ہیں، لکھتے ہیں:

''یہ صحیح نہیں ہے کہ اس کتاب میں دبیر کا تذکرہ انیس کے مقابلے میں کم، بہت کم ہے، لیکن ایسا نہیں ہے کہ دبیر کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا ہو، یا دونوں کی شاعری کا موازنہ نہ کیا گیا ہو یا دبیر کے کمال کا مطلق اعتراف نہ کیا گیا ہو، شبلی نے کئی جگہ دبیر کی علمیت، قوت تخئیل اور مضمون آفرینی کا ذکر کیا ہے۔ تشبیہات و استعارات کی جدت کا بھی تذکرہ کیا ہے، مثالیں بھی دی ہیں۔'' (ایضاً ص۸)

'' ظاہر یہ ذرا سخت رویہ معلوم ہوتا ہے لیکن اگر دبیر کے مراثی کا تفصیل کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تب شبلی کی اس رائے کی صداقت کا صحیح اندازہ ہوگا۔ عام طور سے اظہار ہمدردی بر بنائے روایات کیا جاتا ہے۔ محض اس مفروضے کی بنا پر کہ شبلی نے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا ہے اور ایسے حضرات میں اکثر نے کلام دبیر کا مطالعہ ذرا کم ہی کیا ہوتا ہے، دبیر کے مرثیے پڑھنے کے بعد شبلی کی سخن فہمی و سخن سنجی پر ایمان لانا پڑے گا۔'' (ایضاً ص۸)

عظمت شبلی کے یہ اعترافات اگر ایک عام نقاد کے قلم سے ہوتے تو شاید اس قدر دلچسپی نہ پیدا کرتے۔ چونکہ یہ اپنے عہد کے ایک بڑے محقق کے قلم سے ہیں اس لئے قابل ذکر ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ واقعی موازنہ انیس و دبیر ہمارے کلاسیکل ادب کا بہترین سرمایہ ہے۔

◆◆◆

[۱۰]

وفات شبلی پر تعزیت

(نادر تحریروں، تقریروں اور مراسلات کے حوالہ سے)

علامہ شبلی کے سانحہ وفات [۱۸/نومبر ۱۹۱۴ء] پر متعدد اہل علم اور ادبا و شعراء نے اپنے تاثرات رنج و غم کا اظہار کیا۔ راقم نے اپنی کتاب ''شبلی سخنوروں کی نظر میں'' میں متعدد منظوم تاثرات یکجا کر دئے ہیں۔ منثور تاثرات کی جمع و تدوین بھی پیش نظر تھی۔ وجہ یہ ہے کہ اس سانحہ پر آنسو بہانے والوں میں متعدد ایسے اصحاب فضل و کمال شامل ہیں جو اپنے علمی مقام و مرتبہ میں بلند تو ہیں ہی ان سے علامہ شبلی کے گہرے مراسم و تعلقات بھی تھے۔ خاص طور پر ان تحریروں کا جن کے ذکر و مطالعہ سے ابتک سلسلہ شبلیات کے اوراق سادہ ہیں۔

ان تحریروں کا ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں بعض معاندین اور ناقدین شبلی کی بھی تحریریں شامل ہیں، جس میں ان کی متعدد تند و تیز اور بے جا تنقیدیں بھی ان وفیاتی تحریروں میں شامل ہیں۔ مطالعہ شبلی کے طالب علموں کو ان کا مطالعہ و جائزہ بہر حال ضروری ہے۔

اس مقالہ میں جن تحریروں کو یکجا کیا گیا ہے ان میں بیشتر معاصر اخبارات و رسائل سے نقل کی گئی ہیں۔ بعض اہل علم نے پہلے وفیاتی تحریریں لکھیں، پھر علاحدہ مستقل مضامین و مقالات لکھے۔ اس طرح کے تقریباً تمام مضامین و مقالات ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی [۱۹۵۳-۲۰۲۰ء] نے اپنی کتاب ''شبلی شناسی کے اولین نقوش'' مطبوعہ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ میں یکجا کر دئے ہیں۔ اس لئے ان سے تعارض نہیں کیا گیا ہے، بلکہ اس مقالہ میں وہ نادر تحریریں تقریریں، مراسلات اور تاریخی قطعات شامل ہیں جن کے ذکر و مطالعہ شبلی سے ہماری کتابوں کے

اوراق خالی ہیں۔اس طرح یہ مقالہ شبلی کے بالکل ابتدائی اور اولین نقوش اوراس سلسلہ کی نادر تحریروں اورتقریروں کے تعارف وتجزئے پر مشتمل ہے۔

راقم الحروف نے علامہ شبلی نعمانی کے حوالہ سے الندوہ،لسان الصدق،الہلال،البلاغ اورروزنامہ زمیندار لاہورکا مفصل مطالعہ وجائزہ اپنی کتاب ''شبلی اور جہان شبلی'' میں پیش کر چکا ہے۔سانحہ وفات شبلی پر ہندوستان اوراس سے باہر بر ماوغیرہ جو ماتم ہوئے روزنامہ زمیندار لاہور میں نسبتاً اس کی تفصیلات زیادہ شائع ہوئی ہیں۔''شبلی اور جہان شبلی'' میں اس کی تفصیل صفحہ ۱۶۴ سے صفحہ ۱۹۸ تک پھیلی ہوئی ہے۔یہی وجہ ہے کہ زیرنظر مقالہ میں اس کی تفصیلات سے صرف نظر کیا گیا ہے۔البتہ مقالہ تکمیل کے لئے بعض ضروری باتوں کا ذکرنا گزیرتھا،سوکرنا پڑا ہے۔

اس مقالے میں علامہ شبلی کی وفات اورتعزیت سے متعلق جوتحریریں نقل کی گئی ہیں ان میں بیشتر تحریریں نادرونایاب ہیں اور مطالعہ شبلیات کے حوالہ سے پہلی بار پیش کی جارہی ہیں۔ ۱۰۷ برس پہلے کے جن اخبارات ورسائل سے یہ تحریریں جمع کی گئی ہیں۔زیرنظر مقالہ میں ان کا اندراج الف بائی ترتیب کے مطابق کیا گیا ہے۔اوران کا مختصر تعارف بھی پیش کردیا گیا ہے۔

---

[۱]

الناظر،لکھنو

ماہنامہ الناظر لکھنو کے مدیر ظفرالملک علوی [۱۸۸۴-۱۹۴۶ء] نے ماہنامہ الناظر میں علامہ شبلی کے بعض مضامین اوران کی غزلیں وغیرہ شائع کی ہیں۔علامہ شبلی کی وفات کے بعد انہوں نے ماہنامہ الناظر میں ایک تحریری مقابلہ اردو کا بہترین انشاپرداز کون؟ کا اعلان کیا،جس میں متعدد نوجوان اہل قلم نے شرکت کی۔کم لوگوں کو اطلاع ہوگی کہ پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی [۱۹۰۱-۱۹۶۸ء] نے بھی اس مقابلہ میں حصہ لیا۔اورعلامہ شبلی کی ادبی حیثیت پر عمدہ مقالہ لکھا تھا۔ مگراس مقابلہ میں اعظم گڑھ کے سعید انصاری طالب علم جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا مقالہ ''مولانا شبلی

اردو کے بہترین انشاپرداز'' منتخب ہوا۔اسے مولوی ظفر الملک علوی نے مولانا عبدالماجد دریابادی کے پیش لفظ کے ساتھ علاحدہ کتابی صورت میں ۱۹۲۵ء میں شائع کیا۔اس رسالہ کے ایک سے زاید اڈیشن خودانہوں نے شائع کئے۔ان کے بعدان کے جانشینوں نے بھی طبع کیا۔راقم نے اس سلسلہ کے تمام مقالات جدید طریقہ تحقیق وتدوین کے مطابق مدون کئے ہیں جوعنقریب کتابی صورت میں شائع ہوگا۔

مولوی ظفر الملک علوی نے لکھنو میں ایک مکتبہ الناظر بھی قائم کرر کھا تھا۔ اس کی جو فہرست کتب انہوں نے ماہنامہ الناظر میں شائع کی ہے اس میں علامہ شبلی کی تقریباً تمام تصنیفات شامل ہیں۔اس طرح وہ گویامداح شبلی نظر آتے ہیں،مگر یہ حقیقت واقعہ نہیں بلکہ بقول مولانا عبدالماجد دریابادی [۱۸۹۲-۱۹۷۷ء] وہ علامہ شبلی نعمانی کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔(۱) یہی وجہ تھی کہ مولانا عبدالماجد دریابادی نے دور طالب علمی میں جب علامہ شبلی کی کلامی تصنیف ''علم الکلام'' پرایک طالب علم کے فرضی نام سے سخت تنقیدیں لکھیں تو علوی صاحب نے اسے ماہنامہ الناظر میں بالاقساط شائع کیا۔(۲) دراصل مولوی ظفر الملک علوی بابائے اردو مولوی عبدالحق [۱۸۷۰-۱۹۶۱ء] کے دوستوں میں تھے۔نیز کاکوری کے رہنے والے تھے۔علامہ شبلی کے مخالفین ندوہ میں کئی افراد کا تعلق قصبہ کاکوری سے تھا اور یہ عجب اتفاق ہے کہ علامہ شبلی کے شاگرداور عاشق زار مولانا ضیاء الحسن علوی ندوی بھی کاکوری ہی کے تھے۔

بہرحال مولوی ظفر الملک علوی کی حیثیت ایک مدیراور صاحب قلم کی بھی ہے۔انہوں نے بھی وفات شبلی پر علامہ شبلی کا ماتم کیاہے، جوعلامہ شبلی پران کے خیالات کا آئینہ ہے۔ان کی اس تحریر سے کسی نے ابتک اعتنا نہیں کیا۔ہم اسے یہاں درج کرتے ہیں۔

> ''انجمن (ترقی اردو) نے اپنی ابتدائی زندگی میں جس جلیل القدر انشاپرداز کی گود میں پرورش پائی تھی۔(۳) افسوس ہے کہ وہ ان کامیابیوں کو دیکھنے کے لئے زندہ نہیں رہا جواس نئے دور میں انجمن کوحاصل ہورہی ہیں اوران شاءاللہ ہوں گی۔شمس العلما مولوی شبلی نعمانی نے ۱۸/نومبر [۱۹۱۴ء] کواپنے وطن اعظم

گڑھ میں انتقال فرمایا اور اردو زبان کی جو بیش بہا خدمت وہ کر رہے تھے اس کا سلسلہ بند ہو گیا۔ آزاد، نذیر احمد اور حالی کے بعد جو شخص بزم اردو میں سب سے نمایاں نظر آتا تھا، اس کا اٹھ جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس لئے ہوا خواہان اردو کو اس سانحہ سے جو دلی رنج ہوا، اس پر تعجب نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ مولوی شبلی ایک جلیل القدر انشا پرداز کے سوا اور بھی حیثیتیں رکھتے تھے اور اس خصوصیت میں وہ آزاد وغیرہ سب سے ممتاز تھے۔ اور بہت سے لوگ ہوں گے جو مولانا کی وفات پر اس وجہ سے بھی غم کریں گے کہ جو کام وہ کر رہے تھے وہ ناتمام رہ گیا۔ (۴) اور جو توقعات ان سے وابستہ تھیں ان کے برآنے کی اب کوئی امید نہیں، لیکن یہ حقیقت اب کچھ راز نہیں ہے کہ مولوی شبلی نے اپنی منزلت کو جو نقصان عظیم اپنے آخری ایام زندگی میں پہنچایا، اس کا باعث صرف یہی تھا کہ وہ اپنی پہلی حیثیت چھوڑ کر اس سے آگے قدم مارنا چاہتے تھے۔ (۵) عقائد و عمل کی خرابیوں نے (۶) اگر چہ مولوی شبلی کی وقعت کو سخت صدمہ پہنچایا ہے، لیکن اردو زبان کی جو خدمات انہوں نے انجام دی ہیں ان کو کسی طرح فراموش نہیں کیا جا سکتا، البتہ یہ بالکل صحیح ہے کہ اگر مولانائے موصوف دوسرے جھگڑوں میں مبتلا ہونے کے بجائے (۷) استقلال کے ساتھ اسی کام میں لگے رہتے تو خود ان کے لئے بھی یہ مشغلہ قطع نظر دلچسپی کے حد درجہ قدر و عزت کا باعث ہوتا اور شہرت، منزلت سبھی کچھ ان کو اس وقت سے زیادہ حاصل ہو سکتی اور ماسوا اس کے خود زبان اردو نے میدان ترقی میں بہت کچھ مرحلے طے کر لئے ہوتے۔ بہر حال اب ان کا معاملہ براہ راست اپنے مالک و مولا سے رہ گیا ہے، اس لئے ہمیں صرف یہی دعا کرنا چاہئے کہ خداوند جل اعلی ان کی معصیتوں اور کمزوریوں کو معاف فرمائے۔'' (۸)

[۲]

الہلال، کلکتہ

علامہ شبلی نعمانی نے ۱۸؍نومبر ۱۹۱۴ء کو وفات پائی۔ اسی تاریخ یعنی ۱۸؍نومبر ۱۹۱۴ء کو امام حریت مولانا ابوالکلام آزاد [۱۸۸۸-۱۹۵۸ء] کے اخبار الہلال کلکتہ کا آخری شمارہ شائع ہوا اور پھر الہلال ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود مولانا ابوالکلام آزاد سے انتہائی گہرے مراسم وتعلقات کے اس میں علامہ شبلی پر کوئی وفیاتی مضمون شائع نہیں ہوسکا۔ البتہ اس آخری شمارہ کے سرورق پر مولانا ابوالکلام آزاد نے علامہ شبلی کی ایک نمایاں تصویر کے ساتھ اپنی مختصر مگر بڑی جامع تحریر شائع کی ہے۔

حادثہ فاجعہ علمیہ

وفات مولانا شبلی نعمانی

وما کان شبلی ھلکہ ھلک واحد

و لکنہ بنیان علم تھد ما

فقید العلم مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ تعالی

''نہایت رنج وافسوس کے ساتھ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کی وفات کی خبر درج کی جاتی ہے۔ اس ماتم کے لئے صرف یہ مرقع رفع رنج وغم کافی نہیں کہ اس کے لئے تو الہلال کا ایک پورا نمبر بھی کافی نہ ہوتا۔ لیکن اس وقت تو یہ رونا ہے کہ ہم دل کھول کر اس شہید علم کا ماتم بھی نہیں کر سکتے۔ اس لئے اپنی خوں نابہ فشانیوں کو دوسری فرصت کے لئے ملتوی رکھتے ہیں۔ دردرسیدوں کے ماتم کے لئے کوئی وقت محدود نہیں ہے۔ آبلہ دل ہر وقت پھوٹ بہنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ نشتر غم کی کھٹک چاہئے اور وہ اس حادثہ فاجعہ علمیہ کی بدولت دل میں ہر وقت موجود رہے گی۔'' (۹)

علامہ شبلی نعمانی نے جس وقت وفات پائی ظاہر ہے ان کی موت کے لئے وہی وقت قدرت کی طرف سے متعین تھا۔لیکن اپنے مخالفین کے فتنوں کا سد باب،ندوہ کو نقصان پہنچنے کے خوف سے گذشتہ زندگی کی تمام جد و جہد کے ثمرات سے آنکھ بند کر وطن کے لئے مراجعت ، دارالمصنّفین کے قیام کی فکر میں تگ ودو، جو طلبہ انہوں نے تیار کئے تھے انہیں یکجا کر کے کاروان علم وتحقیق کو شاہراہ علم وتحقیق پر گامزن کرنے کی فکر میں جدوجہد۔سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تکمیل کی شب وروز فکر۔ماہنامہ معارف کے اجرا کے لئے فکرمندی۔اتنے علمی وادبی، تصنیفی وتعلیمی کام بیک علامہ شبلی نعمانی ہی ان نامساعد حالات میں انجام دینے کی جرات کر سکتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے ان کے لئے 'شہید علم' کا لفظ بالکل صحیح طور پر استعمال کیا ہے۔

---

[۳]

اہل حدیث، امرت سر

رسالہ ''اہل حدیث'' امرت سر جماعت اہل حدیث کا ترجمان ہے۔نامور عالم دین مولانا ثناءاللہ امرتسری [۱۸۶۸-۱۹۴۸ء] کی زیرادارت شائع ہوتا تھا۔اور ایک اچھا اور معیاری رسالہ تھا، جس سے لوگوں کو بڑا فائدہ پہنچا۔

مولانا ثناءاللہ امرتسری کی علامہ شبلی نعمانی سے ملاقات کا ذکر ملتا ہے، جس کا ذکر انہوں نے بھی اپنی تحریر میں کیا ہے۔۱۹۱۲ء میں اصلاح ندوہ کا جو عظیم الشان جلسہ مسیح الملک حکیم حافظ محمد اجمل خاں [۱۸۶۸-۱۹۲۷ء] کی دعوت پر دہلی میں منعقد ہوا تھا اور جس میں تمام ہندوستان کے نمائندہ اشخاص شریک تھے۔اس جلسہ کی صدارت علامہ شبلی کی تحریک پر مولانا ثناءاللہ امرتسری کو تفویض کی گئی تھی۔(۱۰) یقینی طور یہاں بھی ملاقات ہوئی تھی۔

مولانا ثناءاللہ امرتسریؒ علامہ شبلی نعمانیؒ سے عمر میں گیارہ برس چھوٹے تھے۔علامہ شبلی کے سانحہ وفات پر مولانا ثناءاللہ امرتسری نے بھی وفیات لکھی ہے۔اس کی اطلاع بہت کم لوگوں کو ہوگی

اور بہتر ہی تھا کہ ابتک لوگوں کو اس کا علم نہیں تھا۔اس قدر خراب وفیاتی تحریر کم از کم میری نظر سے تو آج تک نہیں گذری۔حدیث میں بعد از مرگ درگذر کا معاملہ کرنے کی بات کہی گئی ہے مگر ایک اہل حدیث عالم سے اس کی توقع نہیں کی جاسکتی ہے۔

رسالہ اہل حدیث کے ڈیڑھ کالم میں تین اہل علم کی وفات کا ذکر بشمول علامہ شبلی کیا گیا ہے۔''سیاہ ہفتہ'' کی ابتدائی دو تین اور آخر کی چند سطریں دوسرے جانے والوں سے متعلق ہیں۔ بقیہ درمیان میں علامہ شبلی نعمانی کا ذکر ہے۔میرا خیال ہے کہ علامہ شبلی کو ابتدائی زندگی میں حنفیت کے زیر اثر جماعت اہل حدیث سے تو تعصب تھا اور جو بعد میں زائل ہو گیا تھا،اس کا نتیجہ کسی کو دیکھنا ہو تو وہ مولانا ثناء اللہ امرتسری کی اس وفیاتی تحریر کا مطالعہ ضرور کرے۔

دوسرے صاحب

''دوسرے صاحب ہندوستان کے مشہور مصنف مولانا شبلی ہیں جو ۱۵/روز کی علالت اسہال کے بعد ۱۸/نومبر [۱۹۱۴ء] کو انتقال کر گئے۔انا للہ

مرحوم کی نسبت گو ان کے اعتقادات کے لحاظ سے کسی کو اختلاف ہو، مگر ان کے علم و فضل خصوصاً تاریخ دانی کا غالباً سب کو اقرار ہے۔میں بذات خود مرحوم کو جانتا ہوں اس لئے میری ذاتی رائے نہ یہ ہے کہ وہ لا بشـــــرط شئی مسلمان تھے۔بحیثیت علم تاریخ علماء میں ممتاز تھے۔کتاب سیرۃ النعمان کے زمانہ سے ان کے خیالات بہت ترقی پر تھے۔گو ان کے مخالفوں سے میں نے سنا کہ وہ ملحد ہیں (۱۱)،مگر میں نے ان کو نماز پڑھتے بھی دیکھا۔

مرحوم پہلے شخص نہیں جن کی نسبت ایسا اختلاف ہوا ہو بلکہ ان سے پہلے بھی بہت سے ایسے بزرگ گذرے ہیں جن کی موت پر بعض لوگوں نے ممات اقطب اللہ کہا تھا تو بعض نے فرعون هذا لمنهان.

بہر حال اب وہ ایسے دربار میں جا پہنچے ہیں جہاں پر کوئی بات چھپی

نہیں رہ سکتی ۔جن لوگوں کے مرحوم کے الحاد کا علم ہے وہ اپنے علم کے مکلّف ہیں۔ہمیں ان سے بحث نہیں۔ہم اپنے علم کے موافق کہتے ہیں۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

مرحوم ایک بڑی تصنیف سیرت الرسول (۱۲) میں مشغول تھے۔سنا جاتا ہے کہ اس کی دو جلدیں ختم ہیں۔خدا کرے یہ کام کسی ایسے ہی لائق آدمی کے سپرد ہو جو اس کا پورا اہل ہو۔حضور بیگم صاحبہ بھوپال دام عزہا (۱۳) اس کتاب کی متولی ہیں۔حضور عالیہ کی علم پروری سے توقع ہے کہ اس کا انتظام احسن طریق سے فرمادیں گی۔'' (۱۴)

---

[۴]

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں تعزیت

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے آغاز ہی سے علامہ شبلی کا تعلق اس سے قائم ہوگیا تھا جو تاحیات باقی رہا۔عہد سرسید میں وہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے بڑے متحرک رکن تھے۔ قراردادیں پیش کرتے۔اس کے مباحثوں میں شریک ہوتے۔اور اپنے آرا و خیالات سے قوم کی تعلیمی ترقی میں اپنا حق ادا کرتے۔اس کی تفصیل ایجوکیشنل کانفرنس کے متعلق جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں موجود ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی کی وفات کے فوراً بعد اس کا ایک اجلاس منعقد ہوا تو شرکاء نے ان کی وفات پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔تعزیتی قراردادیں بھی منظور ہوئیں۔اس موقع پر مولانا حبیب الرحمٰن شروانی [۱۸۶۴-۱۹۵۰ء] اور مولانا محمد علی جوہر [۱۸۷۸- ۱۹۳۱ء] نے جو تعزیتی قراردادیں پیش کیں وہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔اس قرارداد کے محرک مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی تھے۔انہوں نے درج ذیل قرارداد پیش کی۔

’’جس رزولیشن کے پیش کرنے کی عزت مجھے دی گئی ہے وہ بہت وقت چاہتا ہے اور اتنا وقت ہے نہیں۔ اور یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ ایک ایسے شخص کے متعلق کچھ نہ کہا جائے جیسے کہ مولانا شبلی مرحوم تھے۔ حضرات اس کانفرنس کے ساتھ علامہ شبلی مرحوم کو ایک خاص تعلق تھا۔ اور وہ یہ کہ جس علمی خدمت کے لئے علامہ موصوف نے کثیر حصہ اپنی عمر اور قابلیت کا صرف کیا اور جس کی بدولت اپنا نام تمام دنیا میں روشن کیا، وہ اسلامی تاریخ ہے۔ ہندوستان کی آب و ہوا کبھی علم تاریخ کو راس نہیں آئی اور ہندوستان میں جب سے مسلمان آئے ہیں، اس وقت سے لے کر اس وقت تک کوئی اعلیٰ پایہ کی اسلامی تاریخ ہندوستان میں تصنیف نہیں ہوئی۔ اس علم کے لوگ عراق و عرب میں پیدا ہوئے۔ یہ اسی اجلاس کے پلیٹ فارم کو فخر حاصل ہے کہ علامہ مرحوم نے اپنی پہلی تاریخی تصنیف کانفرنس کے اجلاس میں پڑھ کر سنائی تھی، جس کا نام مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم ہے۔ مرحوم ہمیشہ کانفرنس کے اجلاس میں شریک ہوتے تھے اور اپنے مفید لکچروں اور مضامین سے فائدہ پہنچاتے تھے۔ یہ تو کانفرنس کا تعلق تھا علامہ شبلی سے۔ علامہ شبلی کا جو تعلق کانفرنس سے تھا وہ ان کی ذات سے وابستہ تھا۔ وہ اس کی تعلیم وتربیت کی مجسم تصویر تھے۔ جو کانفرنس کا مطمح نظر ہے، یعنی مسلمانوں کی قدیم طرز تعلیم کے نقائص اور خرابیوں کو دور کرنا اور جدید تعلیم کے محاسن اور خوبیوں کو اخذ کرنا۔ مرحوم نے مولوی محمد فاروق صاحب عباسی چریا کوٹی سے قدیم طرز کی تعلیم پائی تھی۔ وہ ایک لفظ انگریزی کا نہ جانتے تھے۔ علوم جدیدہ سے ناواقف تھے۔ علی گڑھ پہنچ کر سر سید مرحوم کی صحبت سے مستفید ہوئے اور پروفیسر آرنلڈ سے مل کر علوم جدیدہ سے واقفیت حاصل کی اور اس طرح نئی اور پرانی تعلیم نے مل کر ان میں وہ بات پیدا کی جو انہیں کے ساتھ مخصوص تھی۔

اے حضرات! خیال فرمایئے کہ علامہ شبلی کا انتقال ہوگیا۔ تعلیم کے ذکر سے اگرچہ زمین و آسمان گونج رہا ہے ۔ صاحبزادہ [آفتاب احمد خاں] صاحب نے نقشے تعلیم کے پیش کیئے ہیں۔ان سے بتایا گیا ہے کہ ہم میں تعلیم کی بہت کمی ہے۔تعداد کی کمی تو پہلے ہی تھی، لیکن کس قدر حسرت ناک یہ بات ہے کہ اب علم کی کمی ہوتی جاتی ہے۔علامہ مرحوم کی وفات سے حقیقت میں علم کی کمی واقع ہوئی ہے۔اوراس کا ثبوت یہ ہے کہ ہم میں کوئی ایسا شخص موجود نہیں کہ جو کچھ عرصہ کے بعد علامہ شبلی کا ہم پایہ بن سکے۔ میرے تعلیم یافتہ دوست مجھے معاف فرمائیں گے کہ اگر میں یہ عرض کروں کہ علامہ مرحوم کو جس چیز نے علامہ شبلی بنایا وہ یک رخی تعلیم نہ تھی بلکہ وہ تعلیم مجموعہ تھی قدیم اور جدید تعلیم کی۔ پروفیسر آرنلڈ کی صحبت سے جو بات مولانا شبلی میں پیدا ہوئی وہ مرحوم کی تمام تصنیفات سے ظاہر ہے اور علامہ شبلی کی صحبت سے پروفیسر آرنلڈ پر وہ اثر پڑا کہ انہوں نے پریچنگ آف اسلام جیسی کتاب تصنیف کی۔ میں پھر یہ عرض کروں گا کہ جب تک قدیم اور جدید تعلیم یکجا جمع نہ ہوں ہماری قوم میں مولانا شبلی جیسے علماء پیدا نہیں ہوسکتے۔مولانا شبلی کی وفات علم کی وفات ہے۔ موت العالم موت العالم۔ پس نہایت رنج اور الم کے ساتھ اس رزولیشن کی تحریک کرتا ہوں۔''(۱۵)

کانفرنس کے صدر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں[۱۸۶۷-۱۹۳۰ء] نے بھی اس رزولیشن کی تائید میں تقریر کی اور کہا کہ

''مولانا مرحوم جس درجہ اور قابلیت اور جس برکت کے عالم تھے اس کے لحاظ سے مرحوم کی زندگی اوران کے کارناموں کے متعلق رائے دینا علماء کا کام ہے، مجھ جیسے جاہل کا کام نہیں ہے، لیکن یہ ضرور عرض کروں گا کہ جو استفادہ علمی مجھ کو ان کی صحبت سے حاصل ہوتا تھا ویسا کسی اور کی صحبت سے بہت کم ہوتا تھا۔مجھ کو

بھی عرصہ سے مرحوم کی خدمت میں نیاز حاصل تھا اور میں نے کئی بار ان سے عرض کیا کہ وہ علی گڑھ تشریف لا کر قیام کریں تا کہ وہاں کی سرزمین میں علمی آب و ہوا پیدا ہو مگر افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔ وقت تھوڑا ہے اس لئے میں کچھ زیادہ عرض نہ کروں گا، میں تہہ دل سے رزولیشن کی تائید کرتا ہوں۔'' (۱۶)

اس اجلاس میں رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر [۱۸۷۸-۱۹۳۱ء] بھی شریک تھے، انہوں نے رزولیشن کی تائید کی اور قدرے وضاحت سے کہا کہ

''ایسے جلسوں میں رزولیشن بہت پیش کئے جاتے ہیں اور کانفرنس میں ہمیشہ رزولیشن پاس ہوتے رہے ہیں، لیکن میں یہ کہوں گا کہ ان کی تعمیل بہت مشکل سے ہوتی ہے۔ یہ تعلیمی کانفرنس ہے اور ایک ایسے شخص کے لئے جیسے کہ مولانا مرحوم تھے اظہار افسوس کرنا چاہتی ہے۔ شبلی جیسے شخص قدیم تعلیم سے پیدا ہوئے جدید تعلیم ابتک ایک بھی ایسا شخص پیدا نہ کر سکی تو کیا اب ہمارا یہ فرض نہیں ہے کہ ہماری کانفرنس ایسے وسائل بہم پہنچائے جس سے سیکڑوں شبلی پیدا ہو سکیں۔ مولانا اپنے زمانہ حیات میں تحریک کی تھی کہ ایک دارالمصنّفین قائم کیا جائے، جس میں اس دل و دماغ کے لوگ جنہیں اس فن میں خاص دلچسپی ہے شریک ہو کر کام شروع کریں۔ تصنیف کا کام مضمون نگاری سے بالکل الگ ہے۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ ہندوستان میں اگر ایک مضمون نگار کی ضرورت ہوتی ہے تو اس کے حصول میں کتنی دقتیں پیش آتی ہیں۔ ابتک مضمون نگاری کا کام صرف وہی شخص انجام دیا کرتا تھا جو دنیا کے تمام کاموں سے تھک گیا ہو۔ بہت سے اصحاب ایسے ہیں، جن میں تصنیف وغیرہ کی خاص قابلیت ہے، لیکن دنیاوی ضروریات کی وجہ سے انہیں اس کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ کوئی نائب تحصیل داری کا امیدوار ہے اور کوئی تحصیل داری کا:

فکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں

میں کہاں اور یہ وبال کہاں

کچہریوں میں منصرمی اور کلرکی کے کام کرنے والے اکثر ایسے حضرات ہیں کہ اگر انہیں آزادای سے تصانیف کے کام کرنے کا موقع دیا جائے تو بڑے زبردست کام انجام دے سکیں۔ مصنّفین کا اس وقت کوئی پرسان حال نہیں۔ اسلامی سلطنتوں میں ہمیشہ سے یہ اصول رہا ہے کہ ایسے لوگوں کو انعام و اکرام سے مالا مال کیا جاتا تھا۔ شعرا اور ادبا کو بعض اوقات تصنیف سے زائد خزانہ دیدیا گیا۔ فردوسی اور محمود کے واقعات کا حال ہر شخص کو معلوم ہے۔ آج کل کہا جاتا ہے کہ قوم اور پبلک ہر ایک کام کو کرتی ہے۔ ولایت میں ہر ایک تصنیف کو مصنف کے احباب خصوصیت سے خریدتے ہیں۔ یہاں بجائے اس کے یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ انجمنوں میں وہ کتاب مفت دی جائے۔ احباب کہتے ہیں کہ تم نے ہمیں اپنی کتاب تک نہ بھیجی۔ اخباروں کی بھی یہی حالت ہوتی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ مولانا کہ جیسے لوگ نہ پیدا ہوسکیں۔ یہ لوگ موجود ہیں اور ہو سکتے ہیں۔ ہمیں ایسا کرنا چاہئے کہ ہم انہیں موقع دیں کہ وہ ایسا کر سکیں۔ ہر شخص ایسا نہیں ہے کہ مولانا کی طرح اپنا وقت دیدے اور نہایت استقلال کے ساتھ اس دشوار کام کو جاری رکھے۔ اگر کانفرنس مولانا کی تحریک کے مطابق دارالمصنّفین قائم کر کے کچھ لوگوں کو وظائف دے اور انہیں آزادی سے کام کرنے کا موقع ملے تو بہت کچھ ہوسکتا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ سیرۃ نبویؐ کی دوسری جلد پوری جاوے، اگر آپ چاہتے ہیں کہ اس قسم کی تصانیف آپ کی قوم میں ہوتی رہیں تو ضرور دارالمصنّفین قائم کیا جائے۔ اور موقع دیا جائے کہ ایسی کتابیں طیار کی جاسکیں اور شبلی ایسے لوگ پیدا ہوں۔'' (۱۷)

اس کانفرنس میں مولانا ابوالکلام آزاد [۱۸۸۸-۱۹۵۸ء] بھی شریک تھے۔ انہوں نے ایک علاحدہ رزولیشن دارالمصنّفین کے قیام کے متعلق پیش کیا۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی

نے اس کی تائید کی۔ اور کہا کہ

''علامہ مرحوم کی یہ دیرینہ تمنا تھی کہ قوم میں ایک گروہ لائق اور قابل مصنّفین کا پیدا ہو جو علوم اسلامیہ کے علاوہ تعلیم جدید سے پورے طور سے واقف ہو اور اس کی عملی صورت یہ ہے کہ چند قابل اور لائق نوجوانوں کے لئے وظائف کا انتظام کیا جاوے تا کہ وہ اطمینان وسکون کے ساتھ ایک مقام پر اپنے تمام اوقات اس مشغلہ میں صرف کریں۔

علامہ مرحوم نے اعظم گڑھ میں خاص اسی مقصد کے لئے اپنا ایک مکان اور کتب خانہ وقف کیا ہے۔ اور عملاً اس کا آغاز ہو گیا ہے۔ اگر کانفرنس علامہ مرحوم کی یادگار قائم کرنے کی تجویز کرتی ہے تو اس کا بہترین ذریعہ یہی ہے۔''(۱۸)

مولانا ابوالکلام آزاد کے رزولیشن کی اگرچہ مولانا حبیب الرحمٰن شروانی نے تائید کی مگر مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر نے آفتاب احمد خاں نے لیت ولعل سے کام لیا اور پھر کانفرنس اس سلسلہ میں کچھ نہ کر سکی۔ اور اپنے ایک بڑے محسن کو فراموش کر دیا۔ بعد میں بھی اس سلسلہ میں کچھ نہیں کیا گیا اور خاموشی ہی اختیار کی گئی۔ آخر میں میر نثار حسین مجسٹریٹ نہر (محکمہ آب پاشی) نے فارسی میں ایک قطعہ سے علامہ شبلی کا ماتم کیا۔ چونکہ اس قطعہ کو ہم اپنی کتاب ''شبلی: سخنوروں کی نظر میں''، نقل کر چکے ہیں اس لئے یہاں قلم انداز کیا جاتا ہے۔

---

[۵]

روزانہ پیسہ اخبار، لاہور

مشہور صحافی مولوی محبوب عالم [۱۸۶۲-۱۹۳۷ء] کا اخبار روزانہ پیسہ اخبار لاہور اس عہد کا ایک مشہور اخبار تھا۔ جسے مولوی محبوب عالم نے ۱۸۸۸ء میں جاری کیا تھا۔ اس اخبار میں علامہ شبلی نعمانی کی متعدد تحریریں، خطوط اور مراسلے وغیرہ شائع ہوئے ہیں اور ان سے متعلق بھی خبریں اور

تحریریں چھپی ہیں۔اس کا آغاز انجمن ترقی اردو کی خبروں سے ہوا۔ بعد میں ندوہ سے متعلق خبریں بھی ان کے حوالہ سے شائع ہوتی رہیں۔ ہنگامہ وانتشار ندوہ کے زمانہ میں انہوں نے نہ صرف اس سے متعلق خبریں شائع کیں بلکہ علامہ شبلی کے خلاف بھی بعض مراسلے اور خطوط شائع کئے۔ اور جب علامہ شبلی نے انہیں توضیحی مراسلے لکھے تو انہیں بھی نمایاں طور پر اخبار میں جگہ دی۔ علامہ شبلی ان نام ایک مراسلہ میں لکھتے ہیں:

جناب ایڈیٹر صاحب پیسہ اخبار دام لطفہ!

میرے متعلق جو تہمت آمیز خبریں (مثلاً رام پور وغیرہ میں ماہواریں بند کرانے کے لئے جانا) آپ کے اخبار میں شائع ہوتی ہیں اور پھر مجھ کو آپ مخاطب کرتے ہیں، ان کی نسبت کم از کم یہ دیکھ لیا کیجئے کہ وہ لوگ اپنا نام کیوں ظاہر نہیں کرتے اور اگر ہر گمنام تحریر کی بنا پر مجھ پر سوالات جاری کر دئے جائیں تو میں کہاں تک ان کے جواب کے لئے اپنا وقت صرف کر سکتا ہوں۔

آپ کو معلوم ہے کہ قریباً نو مہینے سے ندوہ کی بے ضابطگیوں کے واقعات بعض معزز اخباروں میں مسلسل شائع ہوتے رہے۔ اسی زمانے میں ندوہ کے ایک ذمہ دار رکن (بابو نظام الدین) جن کو ندوہ کے جلسۂ انتظامیہ نے حسابات کے جانچنے پر مقرر کیا تھا، ان کی رپورٹ شائع ہوئی جس سے حسابات کے متعلق کچھ اچھی رائے نہیں قائم ہوتی۔ یہ بھی ان کی طرف سے شائع ہوا کہ تعمیرات کا حساب مطلق ان کو دکھلایا نہیں گیا۔ اس تقاضے پر بھی تعمیرات کا حساب اب تک شائع نہیں ہوا۔

چار مہینے سے زائد ہوئے سرکاری انسپکٹر مدارس نے ندوہ میں آکر دارالعلوم کا معائنہ کیا اور نہایت مفصل رپورٹ لکھی۔ یہ رپورٹ پرنسپل صاحب اور مدرسین انگریزی نے دیکھی اور اس کے چرچے پھیلے، خود دفتر نظامت سے تمام ارکان کے نام، جن کی تعداد اکاون (۵۱) ہے۔ اس کا اقتباس بھیجا گیا

جس میں یہ فقرہ تھا کہ ''اگر یہ ردی حالت قائم رہی تو سرکاری اعانت دیر تک قائم نہیں رہ سکتی۔'' ان واقعات اور عام خبروں سے اگرچہ ارکان نظامت متاثر نہیں ہوئے لیکن عام اثر کیونکر رک سکتا تھا۔

میں حیدرآباد سے آتے ہوئے بھوپال ٹھہرا اور دو دفعہ حضور سرکار عالیہ کی خدمت میں حاضر ہوا، لیکن ندوہ کے متعلق میں نے ایک حرف بھی نہیں کہا۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ ندوہ کی ماہوار میری ہی درخواست اور میرے اعتماد پر مقرر ہوئی تھی۔ آپ اس بات پر بھی غور فرمائیں کہ میری نسبت غلط خبریں شائع کرنے سے اصل معاملے پر کیا اثر پڑتا ہے۔ میں ہر طرح مجرم سہی لیکن اس سے ندوہ کی خوش انتظامی کیوں کر ثابت ہوسکتی ہے۔

آپ ایڈیٹر کی حیثیت سے قوم اور ملک کی زبان ہیں۔ آپ کو تھوڑا سا وقت اس کام کے لئے نکالنا چاہئے کہ آپ دفتر سے ندوہ کا دستور العمل منگوالیں جو صرف چند صفحات ہیں۔ انقلاب جدید میں جو انتظام کیا گیا، وہ دستور العمل کی رو سے کسی طرح جائز ہوسکتا ہے یا نہیں اگر نہیں ہے اور کارروائیاں بے ضابطہ ہو رہی ہیں تو شخصی بحثوں سے قطع نظر کر کے اصل معاملے پر توجہ فرمائیے۔ میں آپ سے اور تمام خیر خواہان قوم سے استدعا کرتا ہوں کہ ندوہ کے مسئلے میں شخصیت، حیثیت اور پارٹی فیلنگ سے متاثر نہ ہوں۔

شبلی نعمانی

۱۷/اپریل ۱۹۱۴ء (۱۹)

علامہ شبلی کی وفات کی خبر انہوں نے ان لفظوں میں لکھی اور شائع کی ہے۔

علامہ شبلی کا انتقال

''نہایت رنج وقلق سے لکھا جاتا ہے (جیسا کہ کل کے پیسہ اخبار میں ہی شائع

ہو چکا ہے۔) کہ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی صاحب نے پندرہ روز کی بیماری کے بعد اپنے وطن اعظم گڑھ میں بروز چہار شنبہ ۱۸/نومبر [۱۹۱۴ء] کو وفات پائی۔ مولوی شبلی صاحب کے انتقال سے مسلمانان ہند کے پرانے اسکول کا ایک اور نہایت قابل اور عالم بزرگ گذر گیا، جس کی جگہ پر ہو سکنی مشکل نظر آتی ہے۔ آپ نے تاریخ اسلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اردو زبان میں تاریخ اور تذکرہ اور علم کلام میں جو آپ نے ایک درجن کے قریب کتابیں لکھی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو موثر اور سلجھے ہوئے پیرایہ میں مطالب ادا کر سکنے کی انتہا درجہ کی قدرت حاصل تھی۔ فارسی میں بھی آپ نے بہت عمدہ اور دل پذیر نظمیں لکھی ہیں اور اردو نظم بھی کہا کرتے تھے۔ مگر تاریخ اور تذکرہ میں جو کتابیں لکھی ہیں انہیں قوم نے نہایت قدردانی کی نگاہ سے دیکھا۔

ابتدا میں آپ نے اورینٹل کالج لاہور میں مولوی فیض الحسن مرحوم سے تعلیم پا کر مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا تھا۔ پھر علی گڑھ کالج میں عربی کے پروفیسر مقرر ہو گئے۔ اور سر سید احمد خاں مرحوم کی صحبت سے فیض حاصل کی۔ اسی زمانہ سے ایجوکیشنل کانفرنس کے مختلف اجلاسوں میں آپ نے تاریخ اسلام پر نقادانہ لکچر دئے اور اور کتابیں لکھنی شروع کیں اور قسطنطیہ اور شام کی سیاحت کو ٹی ڈبلو آرنلڈ صاحب مصنف پریچنگ آف اسلام کے ساتھ جو اس وقت علی گڑھ کالج میں پروفیسر تھے اور ولایت کو جا رہے تھے ایک ہی جہاز میں روانہ ہوئے۔ واپسی پر سفر نامہ لکھا اور علی گڑھ کی ملازمت ترک کر کے حیدر آباد دکن میں سلسلہ تصانیف دولت آصفیہ کے متعلق ملازمت اختیار کی۔ اس کے بعد گورنمنٹ نظام نے آپ کا مستقل وظیفہ مقرر کر دیا اس پر آپ نے ندوۃ العلماء کے بیت العلوم خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی اور ندوۃ العلماء کو ان کی کوششوں سے بہت فائدہ پہنچا، مگر اخیر میں لکھنو کے بعض

منتظمین ندوہ سے آپ کو کسی قدر شکایت پیدا ہوگئی کہ ندوہ سے قطع تعلق کرلیا اور فریقین اوران کے طرف داروں میں بہت بدمزگی پیدا ہوئی۔ زمانہ قیام لکھنو ہی سے بیگم صاحبہ بھوپال نے آپ کوسیرت نبوی مرتب کرنے کے لئے مالی امداد دے کراس خدمت پر مامور کیا،مگر معلوم نہیں کہ موت نے انہیں اس کے ختم کرنے کی مہلت کیوں نہ دی۔آپ کی دیگر تصانیف سیرت النعمان ، الفاروق،علم کلام دوجلد، فارسی لٹریچر کی تاریخ تین جلد،موازنہ انیس و دبیر، سفرنامہ ٹرکی لکچر اور نظمیں وغیرہ ہیں۔ گورنمنٹ نے آپ کوعلی گڑھ کالج کی پروفیسری کے زمانہ میں ہی شمس العلماء کا خطاب دیا تھا۔عمر کے آخری حصہ میں ان کے پولٹکل خیالات بہت آزاد ہوگئے تھے اور نیشنل کانگریس کے خیالات کے حامی ہوگئے تھے۔ ان کے مذہبی عقائد سے بھی بعض علماء کو اختلاف تھا،مگر انہوں نے ایک کفر کےفتوی کے جواب میں پچھلے دنوں دہلی میں صاف اعلان کردیا تھا کہ وہ حنفی عقیدہ کے پکے مسلمان ہیں۔ چند سال پیشتر جب ایک بندوق کے حادثہ سے آپ کا ایک پاؤں کٹوا دینا پڑا تو آپ نے ایک شعراس مطلب کا لکھا تھا کہ مجھ گنہ گار کا تو سر کٹنا چاہئے تھا نہ کہ صرف پاؤں پر درگذر کیا جاتا۔مسلمانان ہندوستان کوخصوصاً اور علمی دنیا کوعموماً علامہ شبلی نعمانی کے انتقال سے سخت صدمہ پہنچا۔ گواب وہ بڈھے ہوگئے تھے اور نحیف ہی رہتے تھے،مگر ابھی ان کے خاتمہ کا کچھ اندیشہ نہیں تھا۔

سیرت اسلام جو آپ تصنیف کررہے تھے اور جس کی ایک جلد کہا جاتا ہے کہ زیر طبع ہے اور دوسری جلد بھی تیار ہوچکی ہے۔ یہ تو اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ آپ نے ان اعتراضات کے کس قابلیت سے جواب دئے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر مخالفین وارد کیا کرتے تھے۔مگر ہمیشہ آپ نے اسلام کو دشمنوں کیے حملوں سے محفوظ رکھنے کی غیرت کا ثبوت دیا

ہے۔حضرت عمرؓ پر کتب خانہ اسکندریہ کے جلا دینے کا جوالزام مسیحی دنیا نے مدتوں سے عاید کر رکھا ہے آپ نے اس کا بہت متین اور مسکت جواب اردو میں لکھا اور اس کا انگریزی ترجمہ اہل انگلستان کے پڑھنے کے لئے چھپوایا۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر پر جو متعصب لوگ ہندوؤں پر ظلم و جبر کرنے کے الزام لگایا کرتے ہیں ان کا بڑی قابلیت سے ایک مستقل کتاب لکھ کر جواب دیا ہے۔مصر کے مشہور عیسائی مصنف اور افسانہ نگار جرجی زیدان کی بعض تصانیف پر آپ نے تنقید لکھ کر رسالہ المنار میں چھپوائی تھی۔جس کی بابت ۲۴ر جولائی ۱۴ء کے رسالہ المنار میں حسب ذیل فقرہ درج ہے۔

''جرجی زیدان کی کتاب تاریخ التمدن الاسلامی کی تردید کا بہت سے علماء نے ارادہ کیا مگر آخر یہ عظیم الشان مہم ہندوستان کے مشہور فاضل و مورخ علامہ شبلی نعمانی نے سر کی۔ علامہ موصوف ہمارا اور جرجی زیدان کا دوست ہے۔

ہر چند کہ مولانا شبلی صاحب نے کبھی علوم دین میں توغل نہیں رکھا اور نہ اس کا دعوی کیا تھا مگر عربی علم ادب و سیر اسلام کے جاننے میں وہ مسلمانان ہند میں فرد تھے۔اوران کی رحلت سے عالم اسلام ایک بہت بڑے عالم نے کہ جس کی شہرت حدود ہند سے متجاوز ہو چکی تھی، رحلت کی ہے۔ خدا تعالی مرحوم کو جنت نصیب کرے اور قوم کو ان کا نعم البدل بخشے۔

حق مغفرت کرے عجیب آزادمرد تھا(۲۰)

اس تحریر کے علاوہ روزانہ پیسہ اخبار لاہور میں کئی تعزیتی جلسوں کی رودادیں اور بعض قطعات تاریخ بھی شائع ہوئے ہیں۔تعزیتی مراسلات میں کئی مراسلے وہی ہیں جو اخبار زمیندار لاہور میں شائع ہوئے ہیں۔اس لئے ان سے یہاں صرف نظر کیا گیا ہے۔ البتہ تین مراسلے جو تین مقامات لکھنو، کلکتہ اور رنگون برما کے تعزیتی جلسوں اور تعزیتی قراردادوں پر مشتمل ہیں۔ان کو

یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

جس طرح راول پنڈی کے اجلاس میں مجاہد آزادی سیف الدین کچلو شریک ہوئے اور علامہ شبلی کی وفات پر اظہار تاسف کیا۔ اسی طرح مسلم انسٹی ٹیوٹ کلکتہ کے اجلاس میں نامور مجاہد آزادی مولانا ابوالکلام آزاد نے شرکت کی تھی۔ اس لئے ان تعزیتی رپورٹس کی بڑی اہمیت ہے۔

جلسہ تعزیت مولانا شبلی مرحوم، لکھنو

بمقام لکھنؤ

شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی کی وفات سے قوم وملک کو جو نقصان پہنچا ہے، اس پر اظہار تاسف وغم اور مرحوم کے پسماندگان سے ہمدردی کی غرض سے باشندگان شہر ومضافات لکھنؤ کا ایک عام جلسہ بارہ دری قیصر باغ میں بوقت ۳ر بجے سہ پہر بروز یکشنبہ ۳۰ر ربیع الاول ۱۹۱۴ء بزیر صدارت جناب مولانا مولوی کرامت حسین صاحب منعقد ہوا۔ تقریباً ۵۰۰ر حضرات شریک جلسہ تھے، جس میں حسب ذیل تجاویز منظور ہوئیں:

جناب مولانا مولوی کرامت حسین صاحب بتحریک پنڈت سورج نراین بہادر صاحب اور بتائید عبدالمجید صاحب۔ موید صدر نشیں جلسہ قرار پائے۔ پھر مولوی ابوالحسنات، مولوی عبدالشکور صاحب ندوی نے ایک نظم پڑھی اور تجاویز ذیل پاس ہوئیں۔

۱۔ یہ جلسہ باشندگان شہر ومضافات لکھنؤ کا اس رنج والم کا تہہ دل سے اظہار کرتا ہے جو کہ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کی بے وقت وفات سے ہوا ہے اور خدائے ارحم الراحمین سے دعا کرتا ہے کہ مرحوم کی مغفرت کرے اور ان کو مسرت ابدی عطا فرمائے۔

محرک: سید وزیر حسن بی اے، ایل ایل بی وکیل۔

موید: محمد حفیظ صاحب

۲۔ یہ جلسہ علامہ شبلی نعمانی کے صاحبزادے محمد حامد صاحب نعمانی اور دیگر پسماندگان سے نہایت خلوص کے ساتھ اس جانکاہ واقعہ پر اظہار ہمدردی کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ خداوند تعالیٰ ان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

محرک: مسٹر ممتاز حسین صاحب بیرسٹر۔

موید: ڈاکٹر ناظر الدین حسن صاحب بیرسٹر

۳۔ یہ جلسہ علامہ شبلی نعمانی کی قابل قدر اور بے نظیر علمی کارناموں و قومی خدمات کو مدنظر رکھ کر جن میں علامہ موصوف اپنی زندگی میں آخر وقت تک مشغول رہے۔ یہ ضروری سمجھتا ہے کہ ایسے بزرگ کی ایک شاندار اور مفید یادگار قایم کی جائے تاکہ ہماری آئندہ نسلیں ان کے کارناموں سے ہمیشہ مستفید ہوتی رہیں، اور اس غرض کے لئے ایک کمیٹی حسب ذیل حضرات کی منتخب کرتا ہے اور اس کو اضافہ کرنے کا اختیار دیتا ہے۔

[۱] نواب سید محمد علی حسن خان صاحب بہادر [۲] مولانا مولوی نظام الدین حسن صاحب [۳] مسٹر ممتاز حسین صاحب بیرسٹر [۴] ڈاکٹر ناظر الدین حسن صاحب [۵] مسٹر عبدالماجد صاحب [۶] سید سلیمان صاحب پروفیسر عربی پونہ کالج۔

محرک: مولوی نظام الدین حسن صاحب۔

موید: مولوی عبدالرحمٰن صاحب نگرامی ندوی

۴۔ یہ جلسہ جناب عالی ہر ہائینس نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ تاج ہند دام اقبالہا کی شاہانہ علمی ہمدردی اور فیاضی پر دلی شکریہ کا اظہار کرتا ہے جو ہر ہائنیس نے امداد بغرض تکمیل سیرت نبویؐ جاری رکھنے کے معلق حکم صادر فرمایا ہے۔ خداوند تعالیٰ ہر ہائنیس کی عمر و اقبال میں برکت دے۔

محرک: جانب نواب سید محمد علی حسن خان صاحب۔

موید: حکیم محمد عبدالقوی صاحب

۵۔ یہ جلسہ تجویز کرتا ہے کہ تمام کارروائی اس جلسہ کی مع نقل تحریکات منظور شدہ کے اخبارات میں بھیجی جائیں اور نیز تحریک نمبر۴/ جنابہ عالیہ بیگم صاحبہ بھوپال کی خدمت میں مرسل ہو اور نقل تحریک نمبر۲ بخدمت جناب محمد حامد صاحب نعمانی تحصیلدار رئیس اعظم گڑھ بھیجی جاوے۔

محرک: مولوی جواد علی صاحب عالی ندوی۔

موید: ابوالحسنات مولوی عبدالشکور صاحب ندوی

اس کے بعد مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی نے اپنی پر درد نظم سے سامعین کو مستفید فرمایا۔ عبدالماجد صاحب بی.اے. نے صاحب صدر انجمن کے شکریہ کی تحریک اور مولوی علی محسن صاحب ندوی نے تائید کی اور جلسہ برخواست ہوا۔

راقم: خاکسار محمد علی حسن خاں آنریری سکریٹری انجمن اصلاح ندوہ و نواب سید محمد ولی حسن خان صاحب بہادر۔(۲۱)

جلسۂ وفات مولوی شبلی مرحوم، کلکتہ

زیر اہتمام مسلم انسٹی ٹیوٹ ایک جلسہ شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی مرحوم و مغفور کی تعزیت میں بصدارت آنریبل جسٹس سید حسن امام، ۱۵/ دسمبر وقت شام منعقد ہوا۔ حاضرین کی تعداد بہت زاید تھی۔ ہال، کمرہ، وارنڈا وغیرہ سب بھر گئے تھے۔ حاضرین میں اصحاب ذیل کا نام قابل ذکر ہے۔

آنریبل نواب سید شمس الدین، آنریبل مسٹر فضل الٰہی، آنریبل مولوی محمد طاہر، آنریبل نواب سید علی چودھری۔ مولوی نجم الدین احمد۔ مسٹر

شریف،مسٹرمحمدعلی وغیرہ۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے علامہ مرحوم کی حیات علمی و ادبی پر ایک انتہائی بسیط تقریر کی،جس کے بعد ریزولیوشن ذیل پاس ہوئے۔

ا۔ یہ جلسہ شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی کی وفات کو نہ صرف مسلمانان ہند بلکہ تمام عالم اسلامی کے لئے ایک حادثۂ عظیم تصور کرتا ہےاور واقعہ جاں کاہ سے جو نا قابل تلافی نقصان اسلامی علوم اور مسئلہ تعلیم وصلاح اہل اسلام کو پہنچا ہے۔اس کے لئے ماتم گذار اور اشکبار ہے۔

محرک: آنریبل نواب سید نواب علی چودھری۔

موید: ڈاکٹر المامون سہروردی

۲۔ یہ جلسہ مسلمانوں کا قومی فرض سمجھتا ہے کہ علامہ مرحوم کی ایک ایسی یادگار قائم کی جائے،جو ہر طرح ان کی شاندار علمی زندگی کے بقا،ذکر وفیض کے لئے مناسب وموزوں ہو اور اس کے دارالمصنّفین کی تجویز کو پسند کرتا ہے،جو خود علامہ مرحوم کی آخر حیات تحریک ہے۔

محرک:مسٹرمحمدعلی ایڈیٹر کامریڈ

موید مسٹر ایس.ایم.شریف بیرسٹر

۳۔ یہ جلسہ حضور نظام دکن خلد اللہ ملکہ کی فیاض اور علم پرور ریاست سے درخواست کرتا ہے کہ جو ماہوار وظیفہ علامہ مرحوم کو ریاست مذکور سے ملتا تھا وہ اب دارالمصنّفین کے قیام کے لئے بدستور جاری رکھا جائے۔ یا کسی اور باقاعدہ علمی کام کے لئے جو علامہ مرحوم کی علمی خدمات کو جاری رکھے۔

محرک: نواب نصیر الممالک۔موید: آنریبل مولوی محمد طاہر

۴۔ یہ جلسہ تحریک کرتا ہے کہ علامہ مرحوم ومغفور کی ایک مقامی یادگار ایسی بھی قائم کی جائے جو علی الخصوص مسلمانان بنگال میں علمی واسلامی تصنیف و

تالیف کا ذوق پیدا کرے اوراس کے ذریعہ مسلمانان بنگال کے لئے صحیح اور زمانۂ حال کی ضروریات کے مطابق اسلامی معلومات بہم پہنچائی جائیں اوراس کے لئے یہ جلسہ تجویز کرتا ہے کہ مصنفین بنگال کے لئے ایک سالانہ انعام مقابلہ کا اعلان کیا جائے اورزیراہتمام مسلم انسٹی ٹیوٹ ایک فنڈ قائم ہو۔

محرک: مولوی محمد اکرم خان ایڈیٹر محمدی

موید: مسٹر عزیز الحق بی اے (۲۲)

جلسۂ وفات مولوی شبلی مرحوم، رنگون

۳ر دسمبر ۱۹۱۴ء کو طلباء و اسکول سٹاف حاجی یوسف بھائی میاں مسلم اسکول کا ایک غیر معمولی جلسہ بصدارت حاجی محمود یوسف بھائی میاں صاحب شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی کی ناگہانی موت پر اظہار افسوس کے لئے منعقد ہوا۔ بعد تلاوت کلام الٰہی مولوی عبدالرحمٰن صاحب ندوی نے علامہ موصوف کی مختصر سوانح عمری اور مولانا کی اسلامی اور قومی خدمات پر تقریر کی۔ پھر مولوی مراد اللہ صاحب نے مولانا موصوف کی ناگہانی موت کو تمام عالم اسلامی کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان بتایا۔ جلسہ میں حسب ذیل تجاویز باتفاق آراء منظور ہوئیں کہ

۱۔ تمام طلبائے سکول و اسٹاف مولانا مرحوم کی پسماندوں سے ان کی اس مصیبت میں دلی ہمدردی ہے اور علامہ کی بے وقت موت پر اپنے قلبی رنج وقلق کا اظہار کرتے ہیں۔

۲۔ اس اسکول کی نئی بلڈنگ میں (جو عنقریب بننے والی ہے) مولانا کی کوئی یادگار قائم کریں۔

۳۔ اگر طلبائے ندوہ مولانا کی کوئی یادگار قایم کریں تو ہم تمام طلبائے

اسکول، اسٹاف ان کی ہر طرح امداد دیں گے اور ان کے اس نیک کام میں شریک ہوں گے۔

۴۔ چنانچہ اس وقت جناب حاجی محمود یوسف بھائی میاں صاحب نے اپنی طرف سے مبلغ ایک سو روپیہ دینے کا وعدہ کیا بعد دعائے مغفرت جلسہ برخاست ہوا۔ راقم نامہ نگار رنگون (۲۳)

مولوی محمد ابراہیم متخلص بہ قیم، لائل پور کا ایک قطعہ تاریخ روزنامہ زمیندار لاہور ۱۵/ جنوری ۱۹۱۵ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے یہ قطعہ فارسی میں ہے۔ اور بہت متاثر کرتا ہے۔ اسے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

قطعہ تاریخ

انتقال سراسر ملال، جناب مولوی شبلی نعمانی طاب ثراہ و جعل الجنۃ مثواہ

از نتیجۂ طبع

[علامہ حمیم جناب مولانا مولوی محمد ابراہیم متخلص با قیم ساکن لائل پور]

دریغا حسرتا زین دار د بنائے دنیائے فانی — باستغفار رواں شد مولوی شبلی نعمانی

امیر الواعظین حافظ بتر تیبائے قرآنی — علیم و صوفی و شاعر، مسلم در سخن دانی

منصف در علوم عقلی و نقلی چو ہمہ دانی — مثلش کس ندیدہ درجہان بکر خوشخوانی

زفکر سالِ وصلش چوں شدم غروب حیرانی — بگوش ہوش من آمدندار از مطلب حمانی

زنار بخش شومی آگاہ انتہا گیر ہمیں خوانی — بہ جنت جائے دارد مولوی شبلی نعمانی

۱۳۳۳ھ

خوش خوانی میں یائے مصدر یہ ہے۔ اس لئے تکرار قافیہ نہ متصور ہوگا۔

راقم عبدالغنی

از شفاخانہ سلیمی لاہور (۲۴)

[۶]

تہذیب نسواں، لاہور

ہفت روزہ ''تہذیب نسواں'' لاہور سے شمس العلما مولوی سید ممتاز علی [۱۸۶۰-۱۹۳۶ء] نے ۱۸۹۸ء میں جاری کیا تھا۔اس کا بنیادی مقصد اصلاح و بہبود اور ترقی نسواں تھا۔ خواتین میں تعلیم کا فروغ اس کا بنیادی مقصد تھا۔۱۹۴۹ء تک خواتین کا یہ رسالہ نکلتا رہا۔ گویا نصف صدی سے زاید مدت تک اس رسالہ نے خواتین کے مسائل و معاملات کے ساتھ اردو زبان وادب کی بھی خدمت انجام دی۔ علامہ شبلی نعمانی کی وفات ۱۸/نومبر ۱۹۱۴ء پر مولوی شمس العلما سید ممتاز علی نے انتقال پر ملال کے عنوان سے تعزیتی مضمون لکھا تھا، مگر ''تہذیب نسواں'' کا وہ شمارہ دستیاب نہیں ہو سکا۔ البتہ ۱۶/جنوری ۱۹۱۵ء کے شمارہ میں فاطمہ صغرا بیگم دہلی کا وفیاتی مراسلہ شائع ہوا ہے۔ اس کا عنوان یہ ہے:

آفتاب علم غروب ہو گیا۔

آہ! افسوس ہم نہیں جانتے کہ کن لفظوں میں سنہ ۱۹۱۴ء کو یاد کریں اور اس کو کیا کہیں۔ وہ ہمارے علمی خزانے سے دو ایسے جواہر بیش بہا لے گیا جن کا پھر دستیاب ہونا ناممکن ہے۔ آہ! افسوس ۱۸/نومبر کا دن ہماری قوم کے لئے کیسا منحوس دن تھا جب کہ اسے اپنے ایک بہت ہی قیمتی وجود مولانا شبلی سے محروم ہونا پڑا۔ ابھی وہ اس کے ماتم میں چاک گریباں اور زخمی دل تھی کہ ۳۰/دسمبر کے ظالم دن نے قوم کے قابل فخر و مایہ ناز شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی کو بھی ہم سے ہمیشہ کے لئے چھوڑا لیا۔ آہ! یہ قوم کے لئے نا قابل برداشت ماتم ہیں۔ ہم نہیں جانتے کہ مولانا شبلی کو روئیں یا مولانا حالی کا ماتم کریں اور ان کی کن کن خوبیوں کو یاد کریں۔ افسوس اردو کو آغوش محبت میں پالنے والے آج

آغوش لحد میں آرام سے جاسوئے اورقوم کی متلاشی نگاہیں ان کا جانشین ڈھونڈنے کے لئے چاروں طرف جاتی ہیں ،لیکن مایوس واپس آتی ہیں۔ افسوس فلک نے جس گوہرنایاب کوگم کیا پھرزمانہ اس کا ثانی پیدانہ کرسکا اوراب تو امیدنہیں کہ کہ صدیوں بھی وہ ایسے فرزانہ روزگار پیدا کرسکے گا۔ یہ رونا کچھ آج ہی کا نہیں بلکہ تمام عمر کا ہے۔ زمانہ نہ ان کی جگہ کو پر کرسکے گا۔ نہ یہ داغ دل سے ہلکا ہوگا۔ دونوں بزرگ قوم کی رونمائی کے لئے اپنی ایسی نادروبیش بہا تصانیف چھوڑ گئے ہیں جوسربہ فلک عمارتوں سے زیادہ بلنداورعالی شان ہیں۔ اب ہم بجزصبروشکراورکیا کرسکتے ہیں۔اللہ تعالیٰ ان دونوں بزرگان قوم کو جنت میں وہی امتیاز عطافرمائے جواپنی مرحمت خاص سے دنیا میں بخشا تھا۔آمین۔

فقط خاکسار

فاطمہ صغرابیگم دہلی (۲۵)

تہذیب نسواں کی مستقل مضمون نگار فاطمہ صغرابیگم غالباً دہلی کی رہنے والی تھیں۔تہذیب نسواں میں ان کے مضامین اورمراسلات شائع ہوئے ہیں۔اس سے زیادہ ان کے بارے میں معلومات نہیں ہیں۔

مذکورہ مراسلے کے علاوہ 'تہذیب نسواں' لاہور[۲۳رجنوری ۱۹۱۵ء] میں علامہ شبلی نعمانی کی وفات پر کئی قطعات تاریخ اورلوح مزاربھی شائع ہوئے ہیں۔چونکہ یہ قطعات ولوح مزار 'شبلی سخنوروں کی نظر میں' شامل نہیں ہیں،اس لئے یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

قطعات تاریخ وفات علامہ شبلی

[ا]

نومبر میں شبلی نے مرکرلیا جوفردوس میں خوش نما قصر تھا

یہ ہے مصرعہ لاجواب اس کا سال یہ شبلی نہ تھا شبلی عصر تھا

۱۹۱۴ء

لوح مزار

مر چکے قبر ہوچکی تیار ہے یہ ذی الحجہ کا آخری منگل
یہ ہے اک یادگار تاریخی ، مدفن شبلی بہشت محل

۱۳۳۲ھ

چو بگذشت ذی حجہ را بست وہشت بہ جاں آفرین کرد تفویض جاں
بفرمودہ تاریخ سالش لطیف کہ شد شبلی سوئے جناں

۱۳۳۲ھ (۲۶)

ان تین قطعات کے علاوہ لطیف احمد نے ایک اور قطعہ کہا ہے جو تہذیب نسواں ہی میں شائع ہوا ہے۔اور نسبتاً طویل ہے۔

کیوں نہ یوں چھائے رنج وغم کی گھٹا کیوں نہ برپا ہو ماتم و کہرام
کیوں نہ یوں روئیں اشک خوں آنکھیں نیند آنکھوں میں یوں نہ کیوں ہو حرام

کہ وہ علامہ زماں ہمہ داں فاضل افضل و شہیر انام
قوم کی جاں وروح حب وطن مشعل دیں و کوکب اسلام

منطقی فلسفی لبیب ادیب مجتہد اہل فقہ سب کے امام
عید قرباں کی نسبت ہشتم کو ناگہاں پاکے موت کا پیغام

چل بسے اس جہان فانی سے سوئے ملک عدم برائے دوام
وقت پر آخر آکے رہتی ہے ، ہے قضا کی کوئی روک نہ تھام

صاف تاثیر نے جواب دیا کچھ دعا یا دوا نہ آئی کام

شدنی تھی جو کچھ وہ ہو کے رہی کہئے اب کس کو دے کوئی الزام

زیر چرخ بریں بروئے زمیں ڈھونڈ ڈالا بقدر وسعی تمام
اب نہیں کوئی جانشین ان کا ہے اگر تو فقط انہیں کا نام

حق ہے ان کا یہ اے مسلمانو! کہ پڑھیں ان پر اب درود و سلام
دم اظہار نام پاک ہوا قلم دل فگار کو الہام

لکھ دے فصلی میں مصرعہ تاریخ مولوی شبلی بہشت مقام
۱۳۳۲ف

ازلطیف احمد، تتھلی، سارن (۲۷)

قطعہ نگار لطیف احمد کے بارے میں کسی قسم کی معلومات دستیاب نہیں ہوسکیں کہ ایا یہ کون اہل علم اور صاحب شعر و ادب ہیں۔ چونکہ ان کے نام کے ساتھ سارن لکھا ہوا ہے۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ یہ غالباً ضلع سارن بہار کے رہنے والے تھے۔ سارن ہی سے ماہنامہ اصلاح نکلتا تھا اور شاید اب بھی نکلتا ہے، جس میں علامہ شبلی نعمانی پر بارہا سخت تنقیدیں نکلیں مگر تلامذہ شبلی نے ان سے صرف نظر کیا۔ اور واقعی وہ تنقیدیں صرف نظر کے قابل تھیں۔

---

[۷]

پندرہ روزہ خطیب، دہلی

پندرہ روزہ خطیب دہلی کا بہت کم ذکر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے علی العموم لوگ ناواقف ہیں۔ یہ دہلی میں خواجہ حسن نظامی [۱۸۷۳-۱۹۵۵ء] کی سرپرستی اور ملا واحدی دہلوی

[۱۸۸۸-۱۹۷۶ء] کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔اس کے بلند معیار کے بارے میں بس یہ کہنا کافی ہےاس کے مدیر ملا واحدی تھے۔

علامہ شبلی نعمانی کے خواجہ صاحب اور ملا واحدی سے مراسم وتعلقات تھے۔خواجہ حسن نظامی سے تو علامہ شبلی نعمانی کا یارانہ تھا۔خط کتابت اور ملاقاتیں بھی رہیں۔مکتوبات شبلی بنام خواجہ حسن نظامی خود انہوں نے اپنی کتاب'اتالیق خطوط نویسی' حصہ دوم میں شائع کئے تھے۔راقم نے ان خطوط کو اپنی کتاب'مکتوبات شبلی' میں نقل کر دیا ہے۔

علامہ شبلی نعمانی نے جب وفات پائی تو انہوں نے ہفت روزہ خطیب دہلی میں ایک مفصل تحریر لکھی، جو درج ذیل ہے۔

مولانا شبلی نعمانی

''مولانا شبلی کا اٹھ جانا ایسا معمولی واقعہ نہیں جو اس قدر جلد دل و دماغ سے محو ہو جائے، بلکہ ہمارے ہر دن کو گذرے ہوئے دن سے زیادہ سوگوار ہونا چاہئے کہ وہ بھی گذر گیا۔اور کوئی شخص ایسا پیش نہ کر سکا، جو ان کی جگہ پر کرتا۔ مولانا کی صرف علمی خصوصیت ہی ایسی چیز نہیں جو ان کی یاد تازہ رکھنے پر ہمیں مجبور کرے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کا وجود بہت اعتبارات سے اس عہد میں ایسا مغتنم وجود تھا کہ شاید اب مشکل سے اس کا بدل ہمیں مل سکے۔وہ صرف اچھے ادیب اور بلند پایہ مورخ ہی نہ تھے بلکہ وہ اسی درجہ کے مدبر و مآل اندیش بھی تھے۔اور اگر کوئی شخص اس شہید علم کی سوانح عمری لکھنے کی عزت حاصل کرے گا تو اس کو معلوم ہو جائے گا کہ اس حیثیت سے بھی چند خصوصیات شبلی میں ایسی تھیں جن کی بنا پر وہ اس مرحوم کی دانائی وفراست، صحت ہوش وفکر پر ایک مدلل مضمون لکھ سکتا ہے۔ان کی زندگی ایک نمونہ تھی اس قوت وعمل کا جس کی نظیریں قرون اولیٰ میں بہت، اور قرون وسطیٰ میں کم ملیں گی۔ہم جانتے ہیں

کہ آج بھی اسی ہندوستان میں ایسے نفوس موجود ہیں جو شبلی سے زیادہ عالم و فاضل، زیادہ صاحب مطالعہ وصحیح الدماغ ہیں لیکن ہم حقیقت کا انکار کریں گے اگر انہیں شبلی کے برابر وقت کا قدر کرنے والا یا قوت عمل کے اعتبار سے ویسا ہی مستحکم ومضبوط سمجھیں۔ مولانا جانتے تھے کہ حصول علم سے زیادہ نشر علم کی ضرورت ہے۔ اور وہ اس پر عامل تھے۔ وہ جس طرح خود ذوق سلیم کے مالک تھے، اسی طرح اس سے بھی آگاہ تھے کہ ملک میں مذاق صحیح پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ کیا ہے۔ جتنا انہوں نے پڑھا اس سے زیادہ لکھا اور جتنا لکھا اس سے زیادہ اس امر کی کوشش کی کہ پبلک اپنے فلاح کی راہ کو جلد تلاش کر کے پہچان لے۔ چنانچہ ندۃ العلماء کا نشاۃ الثانیہ اس بات کا شاہد ہے کہ ان کا مطمح نظر کیا تھا اور جن ارباب علم کی نگاہ میں مولانا کا نصاب تعلیم ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ ان کا مقصد کیا تھا۔ اور وہ کس رتبہ کے متعلم وہاں سے نکالنا چاہتے تھے۔ بہرحال وہ ایک ایسی چیز تھی جواب ہم میں نہیں اور وہ ایک ایسی نعمت تھی جن کی قدر اب ہم کو معلوم ہوگی۔ اگر ندوۃ العلماء کی ترقی میں کوئی ان کی ذاتی غرض شامل تھی تو وہ ایسی خودغرضی تھی جس پر آج کل کے ہزاروں خلوص وایثار قربان ہیں۔ اور اگر وہ مذہبی اعتبار سے اعتزال پسند تھے تو وہ ایسی گمراہی تھی جس پر موجودہ زمانہ کی مذہب پرستیاں نثار ہیں۔ اب چونکہ وہ ہم میں نہیں ہیں اس لئے غالباً یہ مسئلہ پھر کبھی زندہ نہ ہوگا اور نہ ہونا چاہئے۔ اب اس کے متعلق صرف ایک مقصد وحید ہمارے روبرو ہونا چاہئے کہ وہ کیا تدابیر ہیں جو مولانا کی یاد کو ہمیشہ تازہ وشگفتہ رکھیں۔ چنانچہ یہ معلوم کر کے ہمیں بہت مسرت ہوتی ہے کہ لکھنو میں گذشتہ ہفتہ ایک جلسہ اس امر پر غور کرنے کے لئے منعقد ہوا اور ایک جماعت منتخب کی گئی جو ان دو باتوں کو زیر نظر رکھ کر اپنے مقاصد کی تکمیل میں جدوجہد کرے گی۔ اور وہ دو باتیں یہ ہیں۔ اول تو ندوۃ العلما کی

حالت جس قدر جلد ممکن ہو سنبھالنے کی کوشش کی جائے۔ اور وہ اس سطح پر لایا جائے جو اس کے شایان ہے۔ اور وہ مسئلہ جو اتنے عرصہ سے معرض التوا میں پڑا ہوا ہے اب فوراً طے کر دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ مولانا نے اپنے زمانہ حیات میں دار التصنیف کی بنیاد ڈالنی چاہی تھی وہ بھی تکمیل کو پہنچایا جائے۔ سیرۃ نبویؐ کی طرف سے اب یک گونہ اطمینان ہو گیا ہے کہ حضور علیہ جناب بیگم صاحبہ بھوپال نے اپنی امداد سابقہ کو جاری رکھا ہے اور سیرت کا کام مولوی حمید الدین صاحب اور مولوی سلیمان صاحب کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ چونکہ یہ دونوں حضرات اس کے اہل ہیں، اس لئے امید ہے کہ مولانا مرحوم کی وصیت پوری ہوگی۔'' (۲۸)

---

[۸]

دلگداز۔ لکھنو

ماہنامہ دلگداز لکھنو علامہ شبلی کے ایک دوست اور نامور اہل قلم، صحافی اور ناول نگار مولوی عبدالحلیم شرر [۱۸۶۰-۱۹۲۶ء] کا ماہوار رسالہ تھا۔ اس میں علامہ شبلی نعمانی کا کلام غزلیں، نظمیں وغیرہ شائع ہوتا۔ اور ان کے بعض کتب ورسائل پر عبدالحلیم شرر کے تبصرے بھی شائع ہوئے ہیں۔ علامہ شبلی کی وفات پر انہوں نے پہلے وفیاتی نوٹ [آہ! شبلی آہ!] کے عنوان سے لکھا۔ بعد ازاں ایک مفصل مقالہ لکھا، جسے بہت سراہا گیا اور متعدد مقامات پر نقل بھی کیا گیا ہے۔ ہمارے مرحوم فاضل دوست اور ممتاز محقق ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے اپنی کتاب ''شبلی شناسی کے اولین نقوش'' مطبوعہ دار المصنّفین اعظم گڑھ میں بھی اسے نقل کیا ہے، لیکن اس مقالہ سے پہلے مولوی عبدالحلیم شرر نے جو چند سطری نوٹ لکھا تھا اس کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ چونکہ وہ نوٹ بھی شبلی شناسی کی ابتدائی تحریروں میں شامل ہے اس لئے اس کا اہل علم کے سامنے آنا لازمی اور ضروری ہے۔ اسی

مقصد سے اسے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

آہ شبلی آہ!

''عالم اسلامی میں یہ کس قدر جگر خراش واقعہ ہے کہ شمس العلما مولانا شبلی نعمانی ہم سیاہ کاروں کا ساتھ چھوڑ کے خلد بریں کو سدھار گئے اور ہر مسلمان کی زبان پر ہے کہ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ہم بھی یہی آیۃ کریمہ پڑھ رہے ہیں مگر نہیں معلوم ہمیں یہ سفر کب پیش آئے گا؟اور کب اس عالم سرمدی میں پہنچ کے اپنے قدیم دوست اور پرانے رفیق زندگی شبلی نعمانی سے معانقہ کریں گے۔مولانا شبلی کے حالات زندگی ہم آئندہ نمبر میں لکھیں گے۔اور چونکہ ہماری اوران کی پبلک زندگی کا آغاز قریب قریب ایک ہی زمانے سے ہوا اس لئے شاید ہم اوروں سے زیادہ کامیاب رہیں۔ پنجاب کے اخباروں میں یہ بالکل غلط چھپ رہا ہے کہ مولانا شبلی پنجاب یونیورسٹی کے فاضل تھے۔انہوں نے مولوی فیض الحسن صاحب مرحوم سے پرائیویٹ طور ادب عربی کی کتابیں ضرور پڑھی تھیں،مگر پنجاب یونیورسٹی کو یہ ابھی یہ شرف حاصل نہیں ہوا ہے کہ وہ اس پایہ کا محقق گراں مایہ اور فاضل بلند پایہ پیدا کرے۔مولانا شبلی ان لوگوں میں تھے جو دنیا میں اپنی جگہ خالی چھوڑ گئے۔اوران کا کمال انہیں کے ساتھ گیا۔تاریخ اسلام میں جلب روایت اور تحقیق وتنقید کی جوشان انہوں نے دکھائی ساری دنیا کے موجودہ علمائے اسلام میں سے کوئی نہ دکھا سکا اور ہم آئندہ نمبر بتائیں گے کہ ان کے علمی کمالات نے دنیا پر کیا اثر ڈالا۔اوران کے تصانیف قومی لٹریچر میں کیا اثر رکھتے ہیں۔''(۲۹)

علامہ شبلی نعمانی کی وفات پر ان کے دوست کے یہ اولیں جذبات تھے جو شبلی وشرر پر لکھنے والوں کے پیش نظر کبھی نہیں رہے۔حالانکہ اس تحریر سے نہ صرف ان کے گہرے رنج وغم کا اندازہ

ہوتا ہے بلکہ ایک دوست کی وفات پر دوسرے دوست کے جوفطری جذبات ہوتے ہیں وہ بھی سامنے آتے ہیں۔

---

[۹]

روداد ندوۃ العلماء

۱۹۱۴ء میں علامہ شبلی کی وفات کے چند ماہ بعد ۱۹۱۵ء میں ندوۃ العلماء کا سالانہ اجلاس ہوا۔ اس میں علامہ شبلی کو یاد کیا گیا۔ علامہ شبلی نے اگر چہ اس سے استعفا دیدیا تھا اور وطن چلے آئے تھے۔ اور اپنی ساری توجہ دارالمصنّفین اور سیرت نبویؐ کی طرف مرکوز کر دی تھی لیکن سچ یہ ہے کہ ندوہ مرتے دم تک ان کے دل و دماغ پر چھایا رہا۔

اس جلسہ میں اور دیگر کارروائی ہو رہی تھی، مگر علامہ شبلی کی وفات پر رزولیشن یا اس کا ذکر نہیں ہو رہا تھا۔ شاید یہ بات مولانا غلام محمد فاضل ہوشیار پوری کو ناگوار گذری۔ چنانچہ وہ اسٹیج پر آئے اور علامہ شبلی کی وفات پر تعزیتی رزولیشن پیش کیا کہ

> ''یہ جلسہ جناب شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی مرحوم کی وفات پر دلی حزن وملال ظاہر کر کے اس کا اعتراف کرتا ہے کہ ممدوح نے عرصہ دراز تک بڑے ایثار کے ساتھ اغراض ندوۃ العلما کی کامیابی کے واسطے بیش بہا خدمات انجام دئے ہیں۔ ان کے دعائے مغفرت اور ان کے پس ماندگان کے ساتھ اظہار ہمدردی کرتا ہے۔(۳۰)

اسی اجلاس میں علامہ شبلی کے دوست صفی الدولہ حسام الملک نواب سید علی حسن خاں [۱۸۶۶-۱۹۳۶ء] نے ایک قرارداد پیش کی کہ

> ''اس جلسہ کی رائے میں شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی مرحوم کی ایک یادگار احاطہ دارالعلوم میں قائم ہونا مناسب ہے۔ اور اس کے لئے بہترین شکل یہ ہوگی

کہ ایک عمارت کتب خانہ کے لئے تیار کی جائے اوراس کے واسطے ملک سے
خاص طور پر اعانت کی درخواست کی جائے۔‘‘(۳۱)

---

[۱۰]

ماہنامہ زمانہ، کان پور

اردو کے ممتاز ادیب، شاعر اور نقاد آنجہانی دیانرائن نگم [۱۸۸۲- ۱۹۸۲ء] نے اپنے رسالہ ماہنامہ زمانہ کان پور سے اردو کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ آب زر سے لکھی جانے کے قابل ہے۔ ماہنامہ زمانہ کانپور ۱۹۰۳ء میں جاری ہوا۔ اور غالباً ۱۹۴۹ء تک جاری رہا۔ اس کی طویل اور بہت شاندار تاریخ ہے۔ اس رسالہ اوراس کے مدیر نے اردو زبان وادب کی بڑی گراں مایہ خدمت کی ہے۔ اردو میں جتنے موضوعات پر زمانہ میں مضامین شائع ہوئے اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج جب اردو رسائل وجراید کی تاریخ لکھی جاتی ہے تو زمانہ اوراس کے مدیر دیانرائن نگم کا ذکر بڑے ادب واحترام سے کیا جاتا ہے۔

یہ علامہ شبلی کا معاصر رسالہ تھا۔ اس میں علامہ شبلی کی تخلیقات بھی شائع ہوئی ہیں۔ اوران کی شخصیت، تصنیفات اور خدمات پر بھی مضامین ومقالات اور تبصرے بھی نکلے ہیں۔

علامہ شبلی کی وفات پر سید محمد حفیظ نے ایک مفصل مقالہ لکھا ہے، جو شبلی شناسی کے اولین نقوش کے مرتب پروفیسر ظفر احمد صدیقی کی توجہ حاصل نہ کرسکا۔ حالانکہ یہ اس لائق تھا کہ اس کا انتخاب کیا جاتا۔ اس کے علاوہ مدیر زمانہ دیانرائن نگم نے اپنے جذبات کا اظہار بالکل اچھوتے انداز میں لکھا۔ اس تحریر کا بھی راقم کو شبلیاتی ادب میں کہیں کوئی حوالہ نہیں ملا۔ ان کی اچھوتی تحریر یہ ہے:

بزم ماتم

’’مولانا حالی اور مولانا شبلی نعمانی کی رحلت اردو کے لئے ایک ایسا

صدمہ ہے جس کی تلافی مشکل نظر آتی ہے۔ اردو کے سبعہ سیارہ میں صرف اکیلے حضرت اکبر باقی رہ گئے ہیں۔ سرشار، نذیر احمد، آزاد، ذکاءاللہ، شبلی حالی، ان میں سے ہر ایک کی جگہ خالی ہے۔ اور غالباً عرصہ تک خالی رہے گی۔

اکبر اور وکرمادت کے نورتن مشہور ہیں۔ یہ سبعہ سیارہ بھی اکبری نورتن سے ملتا جلتا ہوا ہے۔ سرشار اگر بیربل ہے تو آزاد فیضی، ذکاءاللہ اگر ملا بدایونی ہیں تو نذیر احمد ٹوڈرمل، شبلی بلاشبہ اس بزم کا ابوالفضل ہے۔ اور حالی اس کا زندہ جاوید رحیم۔ یوں تو اردو شعرا اس دور میں اور بھی ہوئے اور ہیں مگر وہ اپنے کلام کے اعتبار سے میر اور ناسخ کے ہم عصر کہے جا سکتے ہیں۔ یہ سبعہ سیارہ اس دور تغیر کی غیر فانی یادگار ہے۔ جس نے اردو زبان پر اپنے علم و کمال کے نقش جمادئے ہیں۔ ان اراکین میں بجز سرشار کے اور سبھی انگریزی زبان سے ناآشنا تھے۔ مگر ضروریات زمانہ اور رفتار وقت کا جس غائر اور دقیق نگاہ سے انہوں نے مطالعہ اور مشاہدہ کیا، اس پر ہمارے انگریزی کے ماہرین بھی فخر کر سکتے ہیں۔ اردو ادب کی داغ بیل کسی کے ہاتھوں پڑی ہو مگر ان صاحبان کمال نے اسے ایک شاندار اور مرتفع عمارت بنا کر دکھا دی۔ سرشار فسانہ نگاری کا بادشاہ ہے، نذیر ادبی ریاضت کی ایک بےنظیر مثال ہے۔ ذکاءاللہ نے اگرچہ مورخ کی بصارت نہیں پائی تھی، مگر ان کی تالیفات اردو زبان میں ممتاز درجہ رکھتی ہیں۔ آزاد نے جس طرز انشا کی بنیاد ڈالی وہ تتبع کی دسترس سے باہر ہے۔ حالی نے ہمہ گیر دماغ پایا تھا جو ایک نکتہ سنج سخنور بھی تھا، قومی مصلح بھی اور جس کی نثر متانت اور بلاغت کے اعتبار سے اردو میں ایک گراں بہا شے ہے۔ مولانا شبلی کو قدرت سے مورخ کی دقیق نگاہ اور ادیب کی قوت امتیاز عطا ہوئی تھی۔ ان کی تاریخی تصانیف کو نکال ڈالئے تو اردو زبان اس اعتبار سے بہت ہی کم مایہ رہ جاتی ہے۔ اور وہ محض ادیب اور مورخ نہ تھے، وہ شاعر بھی

تھے اور تعلیمات کے ماہر بھی۔قوم کی تعلیمی ضروریات کو سمجھتے تھے۔ تاریخی تحقیقات وتفتیش کاان کی ذات سے خاتمہ سا ہوگیا، ممکن ہے اپنے تاریخی مواخذات میں انہوں نے بعض مواقع پر جذبہ کوواقعہ پر غالب آجانے دیا ہو، مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ آزاد خیال بزرگ تھے اوراپنے پولٹیکل خیالات میں تلون کا الزام عاید ہونے کے خیال کے باوجود بھی دم آخر تک اصلاح سے گریز نہیں کیا۔ ان کے وہ مضامین جو''مسلمانوں کی پولٹیکل کروٹ'' کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں۔اس آزادخیالی کی بیش بہا مثالیں ہیں۔ان کی تاریخی اورملکی نظمیں بھی جوآخری زمانہ کی یادگار ہیں اپنے رنگ میں فرد ہیں۔

الغرض خادمان اردو کی یہ شاندار مجلس درہم وبرہم ہوگئی۔اب صرف حضرت اکبراس دورتغیر کی یادگارصالح باقی ہیں۔موجودہ مصنّفین میں ایسا شاید کوئی بھی نہیں ہے جس نے اردوزبان کواپنی زندگی کا شغل واحد بنالیا ہو۔ فرصت کے وقت تفریح طبع کے طور پر کچھ نظم ونثر لکھ لینا اور بات ہے اور تصنیف کو زندگی کا ماحصل بنالینا شے دیگر۔ایسے چند باکمال بزرگ موجود ہیں جواس قومی جہاز کی ناخدائی کرسکتے ہیں مگر باوجودمل کی افادیت کے رنگ میں رنگے ہونے کے انہیں مصنف کی زندگی پسند نہیں کیونکہ قناعت اور ریاضت دونوں ہی اس پیشہ کی لازمی ضروریات ہیں۔ اردو کا مصنف فی الواقع کسی مستغنی درویش سے کم نہیں حالانکہ شبلی اورحالی دونوں ہی بزرگوں کو اپنی قوم سے نہ صرف زبانی بلکہ عملی قدردانی کے متعلق شکایات کا کوئی موقع نہیں تھا۔(۳۲)

علامہ شبلی نے اخیر دور میں طلبائے ندوہ کومخاطب کرکےایک رباعی کہی تھی۔مدیرزمانہ نے اسی شمارہ میں اسے بھی شائع کیا ہے۔

رباعی شبلی

کئے تھے ہم نے بھی کچھ کام جو کچھ ہم سے بن آئے
یہ قصہ جب کا ہے باقی تھا جب عہد شباب اپنا
اور اب تو سچ یہ ہے جو کچھ امیدیں ہیں وہ ہیں تم سے
جواں ہو تم لب بام آچکا ہے آفتاب اپنا(۳۳)

ماہنامہ زمانہ کان پور میں وفات شبلی پر سید محمد حفیظ نے بھی بڑا اہم وفیاتی مضمون لکھا ہے، مگر انہوں نے خود کو وفیات تک ہی محدود نہیں رکھا ہے بلکہ علامہ شبلی نعمانی کے کارناموں کا بھی ذکر کیا ہے۔

شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی مرحوم

کریں جدائی کا کس کس کے رنج ہم اے ذوق
کہ ہونے والے ہیں سب ہم سے عنقریب جدا

دنیا میں ہر روز لاکھوں آدمی پیدا ہوتے اور مرتے ہیں لیکن ان کی موت و زندگی سے صرف چند ہی اشخاص کچھ روز متاثر رہ کر انھیں ہمیشہ کے لیے فراموش کر دیتے ہیں، مگر چند ہستیاں ان میں ایسی ہوتی ہیں جن کی ذات سے ایک معتد بہ گروہ کو انواع و اقسام کے فائدے پہنچتے ہیں۔ یہ برگزیدہ اشخاص اپنی زندگی کے بہترین اوقات کو خلق اللہ کی خدمت میں صرف کرتے ہیں اور اپنی ذاتی نمود و آسایش کا مطلق خیال نہیں کرتے، یہی وجہ ہے کہ جب یہ مغتنم ہستیاں ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہوتی ہیں تو ہمیں ان کی جدائی بیحد شاق گذرتی ہے۔

علامہ شبلی نعمانی کا وجود بھی انھیں مغتنم ہستیوں میں شمار کیا جاسکتا ہے

جن کی ذات اور علمی کارناموں سے ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو عظیم الشان فائدہ پہنچا ہے۔ ان کے انتقال سے قوم کو ایک نا قابل تلافی نقصان ہوا ہے، جن کی جگہ قوم کے چند بہترین افراد بھی مل کر پوری نہیں کر سکتے۔

مولانائے مرحوم اس پرآشوب زمانہ میں جو غدر ۱۸۵۷ء سے منسوب کیا جاتا ہے بمقام اعظم گڑھ ایک قدیم اور آسودہ حال خاندان میں پیدا ہوئے، آپ کے والد ایک کامیاب وکیل اور آنریری مجسٹریٹ تھے۔ لایق اور علم دوست تھے، اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت پر کافی توجہ دیتے تھے اور تحصیل علم کی نہ صرف تاکید بلکہ سختی بھی کرتے تھے، گو وہ نہایت مرفہ الحال تھے اور ناز ونعم کے ساتھ اپنی اولاد کی پرورش کر سکتے تھے، مگر اصولاً ان کو اس امر پر اصرار تھا کہ تا زمانہ طالب علمی ان کی اولاد نہایت سیدھی سادھی اور طالب علمانہ زندگی بسر کریں۔ چنانچہ مولانا مرحوم کی ابتدائی تعلیم وتربیت اپنی آنکھوں کے سامنے کرائی بعد ازاں مولانا کو غازی پور میں مولوی محمد فاروق صاحب چریا کوٹی کی خدمت میں روانہ کیا، جن سے مرحوم نے معقولات اور فلسفہ حاصل کیا۔ پھر سہارنپور جا کر مولانا احمد علی محدث سے حدیث وفقہ پڑھا، اسی اثنا میں حج کو تشریف لے گئے، وہاں سے واپس آ کر کچھ عرصہ تک لاہور میں علم ادب حاصل کیا اور پنجاب یونیورسٹی کا امتحان مولوی فاضل پاس کیا اور میور سنٹرل کالج الہ آباد کے پروفیسر مقرر ہوئے اسی سلسلہ میں مولانا نے مختاری کا امتحان بھی پاس کیا، مگر اس پیشہ سے انھیں کبھی رغبت نہیں رہی۔

۱۸۸۲ء میں سرسید احمد خاں نے ان کی خداداد قابلیت اور علمی شغف کو دیکھ کر علی گڑھ کالج میں عربی و فارسی کا پروفیسر مقرر کیا، سرسید مولانا کی نہایت قدر ومنزلت کرتے، راقم الحروف کو یہ قطعی طور پر نہیں معلوم کہ تالیف و تصنیف کا آغاز علی گڑھ کے قیام سے ہوا یا اس کے قبل ہی سے یہ سلسلہ جاری

ہوگیا تھا۔ بہر کیف اس میں شک نہیں کہ مولانا کے طبعی رجحان اور علمی تحقیقات میں علی گڑھ کے قیام سے جوفوایدمترتب ہوئے اس کا اعتراف خودمرحوم کوتھا۔ مولانا کی معرکتہ الاراتصنیف الفاروق کا خاکہ علی گڑھ ہی میں کھچا اور جدیدعلوم وفنون سے ایک حدتک واقفیت پیدا کرنے کا شوق بھی اسی مقام میں پیدا ہوا۔

سولہ برس تک علی گڑھ کالج کی خدمت انجام دی، اس عرصہ میں سرسید، مسٹر آرنلڈ اور حالی مرحوم کی صحبت میں تبادلہ خیالات کا نہایت اچھا موقع ملا۔ مسلمانان ہند کی بیداری وترقی کے اہم کام میں مولانا سرسید کے ہمیشہ شریک حال رہے اور مذہبی نقائص وزواید سے قوم کوخبردار کیا اور اپنے مسلسل جدوجہد سے مسلمانان ہند میں احیاءقومیت واشاعت علوم کی ایک زبردست خواہش پیدا کی۔

زمانہ قیام علی گڑھ میں جب آپ الفاروق لکھنے کے لیے مسالہ جمع کر رہے تھے تو روم ومصروشام کا سفر اس شوق وغرض سے اختیار کیا کہ وہ نایاب کتابیں جو ہندوستان میں دستیاب نہیں وہاں کے کتب خانوں میں جا کر مطالعہ کریں تاکہ اس تصنیف کومکمل کرسکیں۔

ان اسلامی ممالک میں مولانا کی خوب قدرافزائی ہوئی بعد واپسی ۱۸۹۴ء میں مولانا کو گورنمنٹ نے بھی شمس العلماء کا خطاب عطا فرمایا۔ اس وقت مولانا کی عمر ۳۷ سال کی تھی۔

دوتین سال خانہ نشین رہ کر الفاروق کوختم کیا اور پھر ریاست حیدرآباد دکن تشریف لے گئے۔ اتنے عرصہ میں مولانا کوعلمی دنیا میں کافی شہرت ہوچکی تھی۔ سرکار نظام نے ناظم علوم وفنون کے جلیل القدر عہدہ پر مامور کیا۔ چار برس تک یہاں قیام کیا اور تالیف وتصنیف کا ایک مستقل صیغہ قائم کیا، اسی اثنا میں جب کہ آپ حیدرآباد میں ناظم علوم وفنون تھے ایک مشرقی یونیورسٹی کا نظام

بھی مرتب کیا،اس کے بعد آپنے ندوۃ العلماء کی بنیاد ڈالی۔

مولانا (شبلی) جب علی گڑھ میں پروفیسر تھے تو مسلمانوں کے تعلیمی حالات پرغور وخوض کا کافی موقع حاصل تھا،جس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ محض انگریزی تعلیم سے مسلمانوں کی دینی اور دنیوی نجات ممکن نہیں اور بغیر تحصیل علوم مشرقیہ مفر نہیں۔ مولانا کا خیال تھا کہ قوم کو ایسے عالموں کی ضرورت ہے جو علوم دینیہ اور علوم مشرقیہ میں پوری دستگاہ رکھنے کے علاوہ جدید علوم وفنون اور تحقیقات اور انکشافات سے بھی پوری واقفیت رکھتے ہوں اسی غرض سے وہ ندوہ کی بقا قیام کو مسلمانوں کی اصلی ترقی کا راز سمجھتے تھے۔

اس سے زیادہ مولانا کے ایثار اور قومی درد کا کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ وہ ریاست حیدرآباد کے ملازمت کو ترک کر کے آستانہ ندوہ پر آ بیٹھے اور اپنے وفات کے ایک سال پیشتر تک اس کی خدمت میں ہمہ تن مصروف رہے چند ناعاقبت اندیش اور خود بین اصحاب نے خدمات ندوہ کے متعلق مولانا کی سخت مخالفت کی اور اکثر لغو ولا طائل الزام بھی لگائے،مگر مولانا کے دل پر درد پر ندوہ کے مقاصد کا خیال اس درجہ حاوی تھا کہ ان عارضی مخالفتوں کا ان پر کچھ اثر نہ ہوا۔مولانا کے اکثر خالص احباب اور اعزا نے مولانا سے درخواست کی کہ وہ ندوہ کے معاملات سے دلچسپی لینا ترک کردیں مگر مولانا اس خیال سے باز نہ آئے۔

مولانا کے زندگی کے عملی کارناموں میں قانون وقف علی الاولاد کے پاس کرانے کی تحریک وکوشش جو مسلمانوں کے لیے بہت بڑی نعمت ہے ہمیشہ یادگار رہے گی،اس مسئلہ کے طفیل میں مسلمانان ہند کے آیندہ نسلوں کو جو بے شمار مالی واقتصادی فوائد پہنچنے والے ہیں ان پر یہاں زیادہ تفصیل اور توضیح سے لکھنا طوالت کا باعث ہوگا۔

گورنمنٹ کے اعلیٰ حکام پر مولانا کے بے لوث رائے اور علمی تجربہ کا سکہ جما ہوا تھا، مسلمانوں کی فلاح و بہبودی کی غرض سے جو کمیٹی یا کانفرنس گورنمنٹ منعقد کرتی اس میں علامہ مرحوم خصوصیت کے ساتھ مدعو کئے جاتے اوران کی آزادانہ رائے اور پختہ تجربہ قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔

۱۹۱۱ء میں مشرقی علوم کے احیاء اور ترقی کے لیے شملہ میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس میں سر ہارکورٹ بٹلر صدر تھے۔اس میں مولانا نے عربی و فارسی تعلیم کے متعلق بہت سے مفید اور کارآمد تجاویز پیش کیں جن میں سے اکثر اب عمل میں لائے جا رہے ہیں۔لوکل گورنمنٹ نے مذہبی اوراخلاقی تعلیم کے مسئلہ پر غور اور رائے زنی کرنے کے لیے ایک کمیٹی قائم کی تھی جس کے مولانا بھی ممبر تھے اردو اور ہندی کے متعلق بھی ایک کمیٹی قائم ہوئی تھی جس کی کارروائی غالباً پرائیویٹ تھی۔مولانا نے اس کمیٹی میں ایک پرزور اور مدلل تحریر پیش کی تھی،جس کا انگریزی میں ترجمہ کیا گیا اور ہر ممبر نے آپ کی دلائل اور براہین کو توجہ سے مطالعہ کیا بعدہ ڈاکٹر سندرلال صاحب کی تحریک سے مولانا کا خاص طور پر شکریہ ادا کیا گیا۔

گذشتہ سال ہندو مسلمانوں میں اتحاد بڑھانے اوراختلافی مسائل کو فیصلہ کرنے کی غرض سے نواب لفٹنٹ گورنر صاحب بہادر نے سر برآوردہ اور با اثر ہندو مسلمان اصحاب کی ایک منتخب کمیٹی قایم کی تھی جس میں مولانا مرحوم بھی مدعو کئے گئے تھے۔

یوں تو مولانا کے عالم خیال میں بیسوں اسکیم بنتے اور بگڑتے تھے،مگر ان میں سے مولانا نے جو اپنی زندگی کے آخری دور میں دارالمصنّفین کا اسکیم مرتب کیا تھا وہ درحقیقت نہایت اہم اور ضروری ہے جس کی طرف اب تک ارباب علم و ہنر نے مطلق توجہ نہیں کی تھی۔لکھنو اور الہ آباد میں کئی مہینہ تک

دارالمصنّفین کی عمارت کے لیے ایک خاموش اور پرفضا خطہ زمین کی تلاش کی مگر ناکامیاب رہے۔آخر میں اپنے وطن یعنی اعظم گڑھ میں اس مفید ترین اسکیم کو عملی صورت میں لانے کا مصمم ارادہ کرلیا۔اور اپنا وسیع مکان اور باغ معہ قیمتی کتب خانہ دارالمصنّفین کے نذر کردیا۔اور اس کے لیے مستقل سرمایہ کی فراہمی کی کوشش کی چنانچہ اس کا آغاز اعظم گڑھ میں ہو چکا ہے اور مولانا حمیدالدین صاحب اور مولوی سید سلیمان صاحب اور مولوی مسعود علی صاحب اس کے انتظام میں مصروف ہیں، اس ضروری اور مفید تحریک کا مقصد یہ ہے کہ وہ علم دوست اشخاص جو تالیف وتصنیف کے کاموں سے دلچسپی رکھتے ہیں اور اپنی زندگی اس کے لیے وقف کرنا چاہتے ہوں وہ بہ اطمینان اس کام کو انجام دے سکیں۔اسی لیے مولانا کا خیال تھا کہ مصنّفین کو پچاس روپیہ ماہواری گذارہ ملنا چاہیے تاکہ وہ بفراغت علمی تحقیقات میں مصروف ہوسکیں اور ایک عالیشان کتب خانہ بھی جمع کیا جائے جس سے مطالعہ میں آسانی ہو اور اسی جگہ قیام بھی کریں۔

امید ہے کہ مولانا کی آخری کوشش جلد بارآور ہوگی اور قدردان علم و ہنر اس کی سرپرستی اور اعانت میں دریغ نہ کریں گے۔

علامہ شبلی کی ساری زندگی علم میں گذری، تالیف وتصنیف کا مشغلہ ابتدا سے تھا حق یہ ہے کہ وہ علم کے لیے پیدا کیے گئے تھے جب تک جئے علم کے لیے جئے، دم واپسیں تک اپنی آخری تصنیف سیرت نبوی کا تذکرہ کرتے رہے، ان کے وہ احباب واعزا جو وفات کے وقت موجود تھے بیان کرتے ہیں کہ بجز سیرت ان کی زبان پر نزع کے وقت بھی کوئی دوسرا لفظ نہ تھا۔

مولانا کی مختلف النوع خدمات کا بہترین ثبوت ان کی تصانیف ہیں، جن کی فہرست حسب ذیل ہیں:

(۱) مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم (۲) مثنوی صبح امید (۳) المامون (۴) الجزیہ (۵) سیرت نعمان (۶) مجموعہ نظم فارسی (۷) سفرنامہ روم ومصر وشام (۸) الفاروق (۹) الغزالی (۱۰) سوانح مولانا روم (۱۱) فلسفہ اسلام (۱۲) تاریخ اسلام (۱۳) الکلام (۱۴) علم الکلام (۱۵) موازنہ انیس ودبیر (۱۶) شعرالعجم ۴ جلدیں (۱۷) رسائل شبلی (۱۸) مقالات شبلی (۱۹) جرجی زیدان پر تنقید (۲۰) اورنگ زیب (۲۱) سیرت نبوی زیر تالیف۔ (مولانا کے علمی کارناموں پر تنقید ایک مستقل عنوان ہے جو زمانہ میں غالباً آیندہ شائع ہو)

مولانا کے اخلاق وعادات نہایت دلکش اور مرغوب خاص وعام تھے۔

مولانا کی طبیعت فطرتاً غیور اور خوددار واقع ہوئی تھی، مرحوم کے برادر عزیز مولوی محمد اسحاق مرحوم ایک روز مولانا کے حالات بیان کرنے لگے اور فرمایا کہ مولانا کبھی بھولے سے بھی کسی شی کی فرمایش اپنے والدین سے نہیں کرتے تھے، ایک بار سردی کے موسم میں مولانا کے پاس کوئی رضائی یا لحاف نہ تھا۔ شب کو دری اوڑھ کر راتیں گذار دیتے مگر زبان کھول کر اپنے والدین سے کبھی درخواست نہ کرتے۔

جب سے مولانا نے ملازمت اختیار کی اپنی آبائی جائداد سے ایک حبہ بھی نہیں لیا بلکہ ذاتی آمدنی پر قانع رہے۔ حیدرآباد سے قطع تعلق کر کے جب مولانا لکھنؤ واپس آئے تو صرف ایک سو روپیہ ماہوار کا منصب مولانا کو ملتا تھا۔ بعض اوقات مولانا کا گذر اس میں نہ ہوتا۔ ایک بار مولوی اسحاق کو معلوم ہوا وہ جانتے تھے کہ مولانا ان سے مالی امداد براہ راست نہ لیں گے، اس لیے ایک رئیس کے نام سے کچھ روپیہ روانہ کیا مگر مولانا نے اس کے لینے سے بھی یک قلم انکار کر دیا۔ اسی طرح جب کسی ریاست میں مولانا جاتے تو رخصتی کے وقت حسب دستور بہ حیثیت عالم ہونے کے مولانا کو ایک معقول رقم دی جاتی اور

مولانا اس کو کبھی منظور نہیں کرتے تھے۔

مولانا مرحوم کی شرافت نفس اور وضعداری کا یہ حال تھا کہ اپنے سخت سے سخت مخالف اور بدگو کی بھی برائی نہیں چاہتے تھے بلکہ خاص کر ایسے اشخاص کے ساتھ وہ سلوک کرنے کی بیحد کوشش کرتے۔ مولانا نہایت بلند نظر اور حوصلہ مند شخص تھے، قومی معاملات سے ان کو خاص دلچسپی تھی ہندو و مسلمان کے اختلافات کو نہایت افسوس کے ساتھ دیکھتے تھے، ایک روز مجھ سے نہایت حسرت آمیز لہجہ میں فرمانے لگے کہ پولٹیکل اختلافات کی وجہ سے اگر ہندو و مسلمان ایک جا ہو کر نہیں چلتے تو علمی میدان اتحاد و ارتباط پیدا کرنے کے لیے کیا کم ہے۔ کیوں نہ ہم لوگ آپس میں ایک دوسرے سے علمی پلیٹ فارم پر آ کر ملیں اور تبادلہ خیالات کریں۔

مولانا مرحوم کا یہ خیال تھا کہ ہندوستان کی حقیقی ترقی بغیر ہندو مسلمانوں میں اتحاد پیدا کئے ہوئے ممکن نہیں اسی لیے مسلمانوں کی پولٹیکل کروٹ کے عنوان سے تین چار مضامین مسلم گزٹ میں شائع کئے تھے۔

بہرحال مولانا کی وفات سے ملک وقوم کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی ناممکن ہے اور آپ کے محاسن کی یاد عرصہ دراز تک تازہ رہے گی۔

بعد از وفات تربت ما در زمیں مجو

در سینہ ہائے مردم عارف مزار ماست

سید محمد حفیظ (۳۴)

آنجہانی دیانرائن نگم [•••] نے وفات شبلی پر وفیاتی نوٹ کے ساتھ علامہ شبلی کی ایک رباعی اور سید محمد حفیظ کے مضمون پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ ''سفیر'' نامی شخص اور شاعر کا ایک قطعہ تاریخ وفات بھی شائع کیا ہے۔ یہ سفیر صاحب کون تھے؟ کچھ معلوم نہ ہو سکا۔

قطعہ تاریخ وفات علامہ شبلی نعمانی اعلی اللہ مقامہ

جان پاک اند ہزاران نوع جسمانی گذشت   تا بہ ملک جاودان زین منزل فانی گذشت
اول اول صورت ذرات بستہ در جماد   و ز جمادے درگل و ریحاں بستانی گذشت
از چمن بیروں شدہ چوں بوئے گل اندر دماغ   ہم چو نفس ناطقہ درشکل انسانی گذشت
ہم چناں دہفت صد ہفتاد قالب شد سفیر   رفتہ رفتہ درقضائے نور یزدانی گذشت
چیست عمر و مرگ یعنی ارتقائے ایں حیات   تاروان درپردۂ اسرار پنہانی گذشت
زندہ جاوید ماند ہم چو شبلی مرد کار   کزمیان است گل بر اوج روحانی گذشت

بعد ازیں دنیائے فانی چوں جہان دیگر است
از جہانے گوئی شبلی نعمانی گذشت

۶۹.....................................۱۹۱۴ء (۳۵)

---

[۱۱]

زمیندار، لاہور

روزنامہ ''زمیندار'' لاہور ہندوستان کے مسلمانوں کا مایہ ناز اخبار تھا۔ اس کے فاضل مدیر علامہ شبلی نعمانی کے ایک شاگرد، ادیب، شاعر، صحافی اور مشہور مجاہد آزادی مولانا ظفر علی خاں [۱۸۷۳-۱۹۵۶ء] تھے۔ غالباً اسی لئے زمیندار لاہور کے صفحات ''ذکر شبلی'' سے زیادہ روشن ہیں۔ ہم نے اپنی کتاب ''شبلی اور جہان شبلی'' میں اس کے حوالہ سے ایک طویل مقالہ لکھا ہے۔ اختصار کے باوجود وہ مقالہ ۴۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس لئے یہاں صرف وفات کی خبر پر اکتفا کیا گیا ہے۔ موضوع کی تکمیل اور تفصیلات کے لئے ناچیز کی کتاب ''شبلی اور جہان شبلی'' کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

علامہ شبلی کا انتقال

نومبر۱۹۱۴ء میں علامہ شبلی جب سخت علیل ہوئے اور زندگی کی امید جاتی رہی تو انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حمیدالدین فراہی اور مولانا سید سلیمان ندوی کو تار بھیج کر بلوایا۔ مولانا سید سلیمان ندوی جب اعظم گڑھ پہنچے تو ان کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ چنانچہ انھوں نے اخبارات کو اس کی اطلاع دی۔ روزنامہ زمیندار میں یہ اطلاع ان لفظوں میں شائع ہوئی ہے:

''مولانا شبلی مایوس کن درجہ میں بیمار ہیں۔ اسہال کسی طرح نہیں رکتے۔ وہ وقت نہ آئے کہ میں قوم کو یتیمی کا پیغام سناؤں۔'' (۳۶)

اس اطلاع پر ایڈیٹر نے ایک نوٹ لکھا ہے کہ

یہ خط اعظم گڑھ سے آیا ہے جہاں اس وقت علامہ موصوف صاحب فراش ہیں اور ہمارے فاضل دوست (مولانا) سید سلیمان ان کی عیادت کو تشریف لے گئے ہیں۔ اس حالت اضطرار میں ہم بجز اس کے اور کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ہندوستان بھر کو یہ دعا کرنی چاہئے کہ

اس کا روشن ترین آفتاب علم واسلام وتاریخ ہمیشہ منور رہے۔ عجل اللہ شفاء ہ وازال واھداہ. (۳۷)

اسی نوٹ کے نیچے ان کی وفات کی خبر شائع ہوئی ہے۔

اناللہ وانا الیہ راجعون

مولانا سلیمان ۱۸رنومبر کو بذریعہ تار اطلاع دیتے ہیں کہ پندرہ روز تک مبتلائے مرض رہنے کے بعد مولانا شبلی کا انتقال ہو گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون. (۳۸)

روزنامہ زمیندار میں علامہ شبلی کی وفات پر متعدد قطعہ تاریخ اور لوح مزار ادباء وشعرا نے لکھے۔ ان میں اکبر الہ آبادی، علامہ اقبال، مولانا سید علی زینبی اور پروفیسر نواب علی بڑودہ کے

اسمائے گرامی شامل ہیں۔

لسان العصر سید اکبر حسین اکبر الہ آبادی کے کلیات میں علامہ شبلی سے متعلق متعدد اشعار کے علاوہ کئی قطعہ تاریخ بھی درج ہیں۔

لفظوں میں اجتماع نہ معنی میں نور ہے
ویران آج کوچہ بین السطور ہے
شبلی کا خامہ صفحہ ہستی سے اٹھ گیا
اب مد آہ ولوح دل ناصبور ہے

شبلی ہی اٹھ گئے تو میں اب جاؤں کس کے پاس
شعر و سخن کی بزم نظر آتی ہے اداس
ڈھونڈا جو دل نے مادہ سال انتقال
پھرنے لگا نگاہ میں یار سخن شناس

۱۳۳۲ھ (۳۹)

ان کے علاوہ زمیندار لاہور میں ایک اور مادہ تاریخ انہوں نے لکھا ہے جو ان کے دواوین میں شامل نہیں۔ وہ درج ذیل ہے:

تھے مولانا شبلی بے شک   اپنے علم وفن میں راسخ
ان کی موت ہے قومی ماتم   سال رحلت فوت مورخ

۱۳۳۲ھ

اس مادہ تاریخ کے نیچے ایک خط شائع ہوا ہے جو غالباً اکبر ہی کے قلم سے ہے اس لئے کہ اس خط سے اس کی وضاحت نہیں ہوتی۔ چونکہ اس خط سے بھی ایک مادہ تاریخ برآمد ہوتا ہے، اس لئے یہ پورا خط یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

جناب ایڈیٹر صاحب زمیندار

سید سلیمان صاحب نے مختصر خط میں آپ کو یہ فقرہ لکھا تھا کہ ''وہ وقت نہ آئے کہ میں قوم کو یتیمی کا پیغام سناؤں'' عجب اتفاق ہے کہ سید سلیمان کے اسی خیال سے مادہ تاریخ برآمد ہوتا ہے۔ بلا تعمیہ و تخرجہ

قوم یتیم گشت آہ

۱۳۳۲ھ

یہ تاریخ مولانا سید سلیمان صاحب ہی کے الفاظ میں ہے۔ مرحوم کے اوصاف کی نسبت جو کچھ کہا جائے طبیعت سیر نہ ہوگی ؎

مراست غم کہ شدم ساکن جحیم فراق

ترا چہ غم کہ بہ سوئے روضہ جناں رفتی

پروفیسر سید نواب علی کی تعزیتی نظم اوپر گذر چکی ہے۔ انھوں نے علامہ شبلی کی وفات پر ایک قطعہ تاریخ بھی کہا ہے جو یکم دسمبر ۱۹۱۴ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ فرماتے ہیں:

شد چو از دنیائے دوں سوئے جہاں شبلی آں علامہ عالی ہمم

کلک نواب از پئے تاریخ فوت ''ابن رشد الہند رفتہ'' زورقلم

۱۳۳۲ھ

روزنامہ زمیندار، لاہور ۲۱ر دسمبر ۱۹۱۴ء کے شمارے میں مولانا سید علی زینبی صاحب استاذ ادب دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو کا فارسی زبان میں طویل قطعہ تاریخ وفات بھی شائع ہوا ہے۔ جو درج ذیل ہے:

دوش رفتیم سوئے دارعلوم ندوہ کہ ہمان است بجا کعبہ روسانی ما

ماند اینم چہ چیز است کہ مارا بکشید جذبہ داشت مگر سورش پنہانی ما

حسرت آلود بہر سمت نظر ہا کردیم درو دیوار جزدا و ز بے جانی ما

اندریں کلبہ احزاں چہ تو آں گفت زبود ہر درے نوحہ گر بے سرو سامانی ما

بعد ازاں ز جلہ دیدیم بخاک افتادہ ہمہ مصروف بزاری و عزا خانی ما

ایں گروہ طلبہ بود کہ نوحہ می کرد　　　بر زبوں بختی خود و در پریشانی ما
گفتم اے دوش نشینان ملائک چہ بود؟　　　ہمہ گفتند فتاد افسر شاہانی ما
خواستم صاف بگویند جوابم آمد
کہ بگو رفت ز ما شبلی نعمانی ما

۱۳۳۲ھ

زمیندار ۳ر دسمبر ۱۹۱۴ء کے شمارے میں علامہ اقبال نے علامہ شبلی کی لوح مزار کے سلسلے میں ایڈیٹر زمیندار کے نام ایک خط لکھا ہے، جسے ایڈیٹر زمیندار نے شائع کر دیا ہے۔ خط کے الفاظ یہ ہیں:

''مندرجہ ذیل الفاظ مولانا شبلی مرحوم ومغفور کے لوح مزار کے لئے نہایت موزوں مناسب ہوں گے کہ انھیں سے ان کی تاریخ وفات کا سال بھی نکلتا ہے:

امام الہند شبلی طاب ثراہ

۱۳۳۲ھ

اس کے بعد ۱۱ر دسمبر ۱۹۱۴ء کے شمارے میں علامہ اقبال کے لوح مزار کے پس منظر میں مولوی سید علی زینبی معلم ادبیات دارالعلوم ندوہ نے لکھا کہ

''عنوان بالا سے ۳ر دسمبر کے زمیندار میں جناب ڈاکٹر شیخ محمد اقبال پی ایچ ڈی نے علامہ مرحوم کے لوح مزار کے لئے جو تاریخ تحریر فرمائی ہے اس میں ایک مصرعہ کی کمی ہے۔ اس لئے ذیل کا فقرہ تاریخی زیادہ موزوں ہوگا:

امام الامام شبلی اطاب اللہ ثراہ

۱۳۳۲ھ

مولانا سید علی زینبی کے متوجہ کرنے پر علامہ اقبال نے مدیر زمیندار کو ایک اور خط لکھا، جس میں انھوں نے اپنے مصرعہ تاریخ کی تصحیح کی۔ خط یہ ہے:

میں نے جو جملہ مولانا شبلی کے لوح مزار کے لئے تجویز کیا تھا وہ اصل میں یہ ہے

امام الہند والانژاد شبلی طاب ثراہ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو خط میں نے آپ کو لکھا تھا اس میں میری غلطی سے لفظ ''والانژاد'' تحریر میں نہ آیا اور آپ کے اخبار میں بھی اسی طرح شائع ہو گیا۔ بہر حال میں اپنی فروگذاشت سے خوش ہوں کہ اس وجہ سے مولانا سید علی پروفیسر ادب دارالعلوم ندوہ لکھنؤ کو ایک ایسا تاریخی جملہ سوجھ گیا جو میرے جملے سے بہت زیادہ موزوں ہے۔

اسی شمارہ میں ایک اور لوح مزار منشی عاشق علی خاں ناطق کلانوری کا نتیجہ فکر ہے:

مولانا شبلی نعمانی نوراللہ مرقدہ

۱۳۳۲ھ

اسی شمارے میں مولوی سعیدالدین رام پوری نے ایک دوسرے فقرے سے تاریخ نکالی ہے جو یہ ہے:

امام زماں مولوی شبلی طاب ثراہ

۱۳۳۲ھ

ایک اور مادہ تاریخ مولوی عبدالرحمٰن نے درج ذیل فقرہ سے مستنبط کی ہے:

آفتاب زہر خاک

۱۳۳۲ھ

اس مادہ تاریخ پر مولانا ظفر علی خاں نے یہ نوٹ لکھا ہے کہ

''یہ مادہ تاریخ بلحاظ سلاست وسادگی متذکرہ سب جملوں سے اچھا ہے مگر اس میں لفظ اللہ کے ۳۶ عدد لئے گئے ہیں جو اصول تاریخ نویسی کے مطابق نہیں۔ اللہ کے عموماً ٦٦/ عدد شمار ہوتے ہیں۔

راقم الحروف نے اپنی کتاب ''شبلی: سخنوروں کی نظر میں'' شائع کردہ ادبی دائرہ اعظم گڑھ میں متعدد شعرا کی وفیاتی منظومات کے ساتھ تاریخی قطعات اور مادہ ہائے تاریخ درج کئے

ہیں۔علامہ شبلی نعمانی کے ایک عزیز دوست مرحوم عزیز لکھنوی نے بھی ایک قطعہ تاریخ کہا ہے، جو ان کے مجموعہ کلام میں شامل ہے۔مگر وہ راقم کو اس وقت دستیاب نہیں ہوسکا تھا جب ''شبلی سخنوروں کی نظر میں'' مرتب کر رہا تھا۔حالانکہ یہ ایک اہم اور قابل ذکر قطعہ تاریخ ہے:

قطعہ تاریخ وفات مولانا شبلی نعمانی رحمہ اللہ

آہ! سر دفتر ارباب کمال — کہ ز دفتر کدۂ فانی رفت
حاکم محکمہ علم حکم — ناظم ملک سخندانی رفت
فاضل وافضل و بے مثل نماند — کامل و اکمل ولاثانی رفت
باکمالے کہ تو آگاہی ازو — ہمہ دانے کہ تو میدانی رفت
ہمتش بین کہ بیک پائے آخر — تا بہ منزل گہ روحانی رفت
راہ داں آمد وہم راہ شناس — رہ دشوار بآسانی رفت
بردل وجان ازرفتن او — رنج روحانی وجسمانی رفت

خاست چوں از سرجان ہاتف گفت
مولوی شبلی نعمانی رفت

۱۳۳۲ھ(۴۰)

اس موقع پرانہوں نے ایک مسدس بھی کہی ہے۔

مسدس بروفات مولانا شبلی نعمانی

اے دل افسانہ پر درد بگو — زان جوان مرد جہاں گرد بگو
کہ سوئے خلد سفر کرد بگو — برہ ورسم بر آورد بگو

ازسخن تاج جہاں بانی رفت
مولوی شبلی نعمانی رفت

دشمن اہل خرد دوراں شد　　خالی از علم وعمل گنہ یاں شد
از ادب وزطلبش حرماں شد　　ملک معنی وبیان ویراں شد
ازسخن تاج جہاں بانی رفت
مولوی شبلی نعمانی رفت

خلقے از چرخ کہن می نالد　　خلقے از رنج ومحن می نالد
ہر یک ازاں سخن می نالد　　درچمن مرغ بہ چمن می نالد
ازسخن تاج جہاں بانی رفت
مولوی شبلی نعمانی رفت

دست جور فلک کور سواء　　دفتر دولت دیں داد بیاد
یک قلم علم وعمل رفت زیاد　　قلم از کف علم از ہا افتاد
ازسخن تاج جہاں بانی رفت
مولوی شبلی نعمانی رفت

۱۳۳۵-۳=۱۳۳۲ھ　　(۴)

---

[۱۲]

ماہنامہ نظام المشائخ، دہلی

علامہ شبلی نعمانی کی وفات ۱۸/نومبر ۱۹۱۴ء کے وقت ملا واحدی [۱۸۸۸-۱۹۷۶ء] ماہنامہ نظام المشائخ دہلی کے مدیر تھے۔ یہ رسالہ خواجہ حسن نظامی کی سرپرستی میں نکلتا تھا۔ علامہ شبلی کی ۱۸/نومبر ۱۹۱۴ء کو وفات پائی، مگر ملا واحدی دہلوی نے فروری ۱۹۱۵ء میں وفیاتی تحریر شائع کی۔ تاخیر کی وجہ بھی انہوں نے بتائی ہے۔

ملا واحدی مرحوم کی یہ وفیاتی تحریر بھی اب تک کسی کی توجہ حاصل نہیں کرسکی ہے۔ اس کی

بنیادی وجہ اس کی عدم دستیابی ہے۔ ورنہ ضرور تھا کہ پروفیسر ظفر احمد صدیقی اسے اپنی کتاب ''شبلی شناسی کے اولین نقوش'' میں شامل کرتے۔ بہرحال یہ نادر تحریر قارئین کے نذر ہے۔

مولانا شبلی نعمانی

''کل جو ہم میں تھے اور آج وہاں ہیں جہاں سب کو جانا ہے۔ آپ کی وفات کی خبر گو تمام اخبارات میں نکل کر اب بظاہر پرانی ہو چکی ہے، لیکن دراصل یہ وہ روح فرسا خبر ہے کہ مدت دراز تک پرانی نہیں کہی جاسکتی۔ علامہ مرحوم نے ایک ایسی جگہ خالی کی ہے جس کا پر ہونا مشکل نظر آتا ہے۔ اس لئے ان کی رحلت پر جتنا رنج کیا جائے تھوڑا ہے۔ وہ عہد آخر کے لاثانی شخص تھے۔ ان کی زبان میں شیرینی تھے۔ ان کے کلام میں لوچ تھا۔ وہ اول درجہ کے مقرر تھے۔ وہ اول درجہ کے مصنف تھے۔ انہوں نے اپنی ساری عمر علوم کی خدمت میں صرف کی۔ ندوۃ العلما کے وہ بانیوں میں سے تھے۔ اور اس کے موجودہ امتیاز و شان کو تو یقیناً ان کی کوششوں کا نتیجہ ماننا چاہئے۔ قوم شبلی کے احسانات سے سبک دوش نہیں ہوسکتی۔ المامون الفاروق، سیرۃ النعمان، سوانح عمری مولانا روم، بیان خسرو، فلسفہ اسلام، تاریخ اسلام الکلام، علم الکلام وغیرہ وغیرہ متعدد کتابیں مولانا کی زبردست و مستحکم یادگاریں ہیں۔ جن سے ان کا نام صدیوں تک صفحہ عالم پر قائم رہے گا۔ افسوس کہ سیرۃ نبویؐ آپ کے ہاتھوں تکمیل کو نہ پہنچی اور وہ اس کا ارمان اپنے ساتھ لے گئے۔

سنا ہے کہ اپنے برادر عم زادہ مولوی حمید الدین صاحب بی اے اور شاگرد رشید مولانا سلیمان صاحب ندوی کو وصیت کر گئے ہیں کہ وہ اس نیک اور ضروری فرض کو پورا کریں اور یہ آخری انتخاب بھی مرحوم کا لائق داد و ستائش ہے۔

اس سیرۃ نبویؐ کے ذکر میں مولانا کے دو شعر یاد آ گئے جو انہوں نے چار پانچ مہینے گذرے نظام المشائخ میں درج کرنے کے لئے ہمیں عنایت فرمائے تھے۔

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہاہوں سیرۃ پیغمبر عالم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

الٰہی! تو شبلی کی اس نیت کو قبول فرما اور انہیں اپنے سایہ رحمت میں جگہ دے۔(۴۲)

---

[۱۳]

اخبار مخبر عالم۔مراد آباد

اخبار مخبر عالم مراد آباد سے ۸؍جون ۱۹۰۳ء میں قاضی عبدالعلی عابد کی ادارت میں جاری ہوا تھا اور تقریباً ایک صدی تک جاری رہا اور شاید اب بھی جاری ہے، مگر اب یہ اردو کے بجائے ایک ہندی اخبار ہے۔

۱۹۱۴ء میں علامہ شبلی نے وفات پائی تو اور اخبارات ورسائل کی طرح اخبار مخبر عالم نے بھی تعزیتی مضمون لکھ کر تعزیت کی۔مضمون سے اندازہ ہوتا ہے کہ مضمون نگار علامہ سے قریب سے واقف تھے۔

علامہ شبلی مرحوم

یہ خبر نہایت رنج و ملال کے ساتھ سنی جائے گی کہ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی

صاحب نے چندروز کی بیماری کے بعد اپنے وطن اعظم گڑھ بروز بدھ ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو وفات پائی، مولوی صاحب کے انتقال سے مسلمانان ہند کا پرانے اسکول کا نہایت قابل اور عالم بزرگ گذر گیا کہ جس کی جگہ اب پر ہونا دشوار معلوم ہوتی ہے۔ آپ نے تاریخ اسلام کا بڑا مطالعہ کیا تھا اور اردو زبان میں تاریخ و تذکرہ اور علم کلام میں جو آپ نے ایک درجن کے قریب کتابیں لکھی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو موثر اور سلجھے ہوئے پیرایہ میں مطالب ادا کرنے کا اعلی درجہ کا محاورہ تھا۔ فارسی میں بھی آپ نے بہت عمدہ اور دل پذیر نظمیں لکھی ہیں اور اردو میں بھی نظمیں لکھا کرتے تھے۔ مگر تاریخ اور تذکرہ میں جو کتابیں لکھی ہیں انہیں قوم نے نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا ابتدا میں آپ نے اورینٹل کالج لاہور میں مولوی فیض الحسن صاحب مرحوم سے تعلیم پا کر مولوی فاضل کا امتحان پاس کیا تھا پھر علی گڑھ کالج میں عربی کے پروفیسر مقرر ہو گئے اور سرسید احمد خاں مرحوم کی صحبت سے فیضیاب ہوئے۔ اسی زمانے سے ایجوکیشنل کانفرنس کے مختلف اجلاسوں میں آپ نے تاریخ اسلام پر لیکچر دئے اور کتابیں لکھنا شروع کیں۔ آپ نے قسطنطنیہ اور شام کی سیاحت کی۔ واپسی پر سفر نامہ لکھا اور علی گڑھ کالج کی ملازمت ترک کر کے حیدرآباد دکن میں سلسلۂ تصانیف دولت آصفیہ کے متعلق ملازمت اختیار کی۔ اس کے بعد گورنمنٹ نظام نے آپ کا مستقل وظیفہ مقرر کر دیا۔ اس پر آپ نے ندوۃ العلماء کے بیت العلوم کی خدمت کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی۔ اور ندوۃ العلماء کو ان کی کوششوں سے بہت فائدہ پہنچا۔ مگر اخیر میں لکھنؤ کے بعض منتظمین ندوہ سے آپ کو اس قدر شکایت پیدا ہوگئی کہ آپ نے ندوہ سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ زمانہ قیام لکھنؤ سے ہی بیگم صاحبہ بھوپال نے آپ کو سیرت نبوی مرتب کرنے کے لئے مالی امداد دے کر اس خدمت پر مامور کیا۔ مگر معلوم نہیں

موت نے انہیں اس کے ختم کرنے کی مہلت کیوں نہ دی۔

آپ کی دیگر تصانیف سیرت نعمانی، الفاروق،علم کلام دو جلد، فارسی لٹریچر کی تاریخ تین جلد، موازنہ انیس و دبیر، سفر نامہ ترکی، لیکچر اور نظمیں وغیرہ ہیں۔ گورنمنٹ نے آپ کو علی گڑھ کالج کی پروفیسری کے زمانہ میں ہی شمس العلما کا خطاب دے دیا تھا۔ عمر کے آخری حصہ میں ان کے پولٹیکل خیالات بہت آزاد ہو گئے اور نیشنل کانگریس کے خیالات کے حامی ہو گئے تھے۔ ان کے مذہبی خیالات وعقائد سے بھی بعض علماء کو اختلاف تھا مگر انہوں نے کفر کے ایک فتوے کے جواب میں پچھلے دنوں دہلی میں صاف اعلان کر دیا تھا کہ وہ حنفی عقیدے کے پکے مسلمان ہیں۔ چند سال پیشتر ایک بندوق کے حادثہ سے آپ کا ایک پاؤں کٹوا دیا گیا تھا تو آپ نے ایک شعر میں یہ مطلب لکھا تھا کہ مجھ گنہگار کا تو سر کٹنا چاہئے تھا نہ کہ صرف پاؤں پر درگذر کیا گیا۔

مسلمانان ہند کو خصوصاً اور علمی دنیا کو عموماً علامہ شبلی نعمانی کے انتقال سے سخت صدمہ پہنچا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا (۴۳)

---

[۱۴]

ماہنامہ افتخار، جاورہ

ہز ہائی نس نواب سر محمد افتخار علی خاں صاحب صولت جنگ فرمانروائے ریاست جاورہ کے خطاب ملنے کی یادگار میں جاورہ سے ماہنامہ افتخار جاری ہوا۔ اسے نامور شاعر حضرت بیدل نکالتے تھے۔ محمد لطف علی خاں سہیل رسالہ کے سب ایڈیٹر تھے۔ سہیل کو حضرت بیدل سے شرف تلمذ بھی حاصل تھا۔ وہ جاورہ کے سرکاری مطبع دارالطبع میں منصرم بھی تھے۔

ماہنامہ افتخار کب جاری ہوااور کب تک شائع ہوتا رہا،اس کی تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔افتخار ماہ نومبر۱۹۱۴ء کے شمارہ میں علامہ شبلی کے سانحہ وفات پر قطعہ تاریخ رحلت شائع ہوا ہے، جو سید ابن علی محشر کا نتیجہ فکر ہے۔سید ابن علی محشر بھی جاورہ ہی کے رہنے والے تھے۔ان کے مزید حالات وواقعات معلوم نہ ہوسکے۔قطعہ تاریخ رحلت شبلی درج ذیل ہے:

کیا یک بیک دیا ہمیں داغ مفارقت — راہی سوئے عدم ہوئے شبلی نامدار

ہیہات علم وفضل کا گل ہوگیا چراغ — آئی خزاں زمانہ میں رخصت ہوئی بہار

ایسے وحید عصر کی بے وقت موت سے — کیا فائدہ ہوا تجھے اے چرخ کج مدار

ہر سمت آہ ونالہ وشیون کی ہے صدا — مخلوق ہر طرف نظر آتی ہے سوگوار

محشر سروش بادل غم گیں و دردمند

سال وصال گفت ۔ خردمند روزگار ۱۳۳۲ھ

ہوا مرگ شبلی سے اک حشر برپا — قیامت نمایاں ہوئی ہے جہان میں

رقم کرو محشر چنیں سال رحلت — گیا طوطی ہند باغ جنان میں

(ماہنامہ افتخار جاورہ، نومبر۱۹۱۴ء، ص ۲۸-۲۹)

---

[۱۵]

ماہنامہ ظل السلطان، بھوپال

ماہنامہ ظل السلطان ریاست بھوپال سے نکلتا تھا۔اس کے مدیر منشی محمد امین زبیری[۱۸۷۰-۱۹۵۸ء] تھے۔ان سے علامہ شبلی سے مراسم وتعلقات تھے۔خط وکتابت کا سلسلہ بھی مدۃ العمر قائم رہا۔اس کے بڑے مفید نتائج برآمد ہوئے۔سیرت کی تکمیل واشاعت اسی ریاست بھوپال کی حکمراں اورنہایت فیاض وسخی سلطان جہاں بیگم کی بدولت انجام کو پہنچی تھی اس میں منشی محمد امین

زبیری کا بھی دخل تھا۔

بعد میں ان کے اور مولانا سید سلیمان ندوی کے درمیان خطوط شبلی بنام عطیہ وزہرا فیضی کی اشاعت کو لے کر نااتفاقی ہوئی اور پھر وہ دشمنی میں بدل گئی، چنانچہ زبیری صاحب نے سید صاحب کے بجائے علامہ شبلی ہدف تنقید وتنقیص بنایا اور پھر مدۃ العمر علامہ شبلی کی شخصیت کو مجروح کرتے رہے۔لیکن وہ پہلے ایسے نہ تھے اس لئے کہ علامہ شبلی کی وفات پر انہوں بڑا پر اثر مضمون لکھا تھا۔ اس مضمون کا کہیں ذکر نہیں آتا۔ پروفیسر ظفر احمد صدیقی مرحوم کی کتاب ''شبلی شناسی کے اولین نقوش'' میں بھی یہ شامل نہیں ہے۔اس لئے نقل کیا جاتا ہے:

آہ شبلی

۱۸رنومبر۱۹۱۴ء وہ منحوس تاریخ ہے جس میں نہ صرف مسلمانان ہند بلکہ کل دنیائے اسلام کے ایک ممتاز ترین مورخ نے جہان فانی سے عالم جاودانی کو سفر کیا۔ زبان قلم میں طاقت نہیں ہے کہ اس صدمہ عظیم کا ایک شمہ بھی ادا کر سکے جو مولانا شبلی نعمانی کی ناگہانی وفات سے ہمارے دل پر ہوا ہے۔ ہندوستان کے ہر مسلمان نے جو اپنے دل میں ذرا سا بھی علمی ذوق رکھتا ہے اس وحشت ناک خبر کو بغیر دلی رنج وافسوس کے نہیں سنا ہوگا۔

مولانا شبلی ایک متبحر عالم تھے۔تاریخ اسلام کی ہر شاخ میں ان کو جو درجۂ کمال حاصل تھا اس درجہ کا شاید ہی کوئی ہو۔ نہ صرف تاریخ میں بلکہ قریباً کل اسلامی علوم وفنون میں ان کو کامل دستگاہ تھی۔ان کی تصانیف اس جامعیت فنون کی شاہد ہیں۔عربی ادب میں وہ ید طولیٰ رکھتے تھے۔ فارسی لٹریچر میں جو عمیق واقفیت ان کو تھی ''شعر العجم''اس کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے۔اساتذۂ فارسی کے چیدہ چیدہ اشعار میں سے شاید ہی کوئی شعر ہو جو ان کی زبان پر نہو۔

فرنچ بھی اس قدر جانتے تھے کہ علمی وتاریخی کتابیں پڑھ کر سمجھ لیتے تھے غرضکہ مولانا مختلف کمالات کا مجموعہ تھے۔

افسوس! بے رحم موت کی بجلی ہمارے باغ علم کے اسی درخت پر گری جو سب سے زیادہ

ثمر دار تھا۔

مولانا کی کل تصانیف میں علاوہ دیگر خصوصیات کی بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ انتہائی تحقیق و تفتیش اور تنقید و درایت کا نتیجہ ہے۔ تاریخی و علمی مضامین کا وہ جس خوشنما انداز، عالمانہ انداز، عالمانہ فصاحت و بلاغت اور سنجیدہ و متین طریقے سے ادا کرتے تھے کہ اردو میں اس سے بہتر غیر ممکن ہے۔ اردو زبان کو سب سے زیادہ جس نے وسیع کیا وہ مولانا شبلی ہی تھے۔ اگر چہ ابتدا سے ان کی تصانیف کا موضوع تاریخ رہا ہے، مگر اور جس موضوع پر انہوں نے قلم اٹھایا اس میں بھی ان کی شان تبحر صاف نظر آتی ہے ہر مضمون کو ایسے موزوں و مناسب پیرایہ میں لکھتے تھے کہ کوئی پہلو باقی نہیں رہتا تھا اور اس پر اضافہ کی بہت کم گنجائش رہتی تھی۔ حشو و زوائد سے ان کی تحریر بالکل پاک ہوتی تھی ان کی وسعت نظر اور معلومات کا یہ عالم تھا کہ علمی، مذہبی، فقہی اور تاریخی جس قدر سوالات ہندوستان کے علاوہ مصر اور یورپ سے ان کے پاس آتے تھے ان کا قلم برداشتہ جواب لکھ دیا کرتے تھے۔ اکثر لوگ ان سے علمی مسائل اور مذہبی شکوک رفع کرنے آتے تھے، مولانا ہر سوال کا نہایت تسکین بخش جواب دیتے تھے اور مشکل مشکل مسائل کو چھوٹے چھوٹے سے جملوں میں حل کر دیا کرتے تھے۔ ان کی زندگی سرتا پا علمی زندگی تھی۔ ان کا بہت کم وقت علمی تحقیقات، تصنیف و تالیف اور مطالعہ کتب سے خالی جاتا تھا۔ ان کا حافظہ اس غضب کا تھا کہ جس کتاب کو وہ ایک مرتبہ دیکھ لیتے تھے اس کے کل مضامین ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتے تھے۔ ان کے نزدیک ہر دم علمی ذکر واذکار اور مسائل کا چرچا رہا کرتا تھا ان کی صحبت میں بیٹھنے والے بہت سے نئے معلومات لے کر اٹھا کرتے تھے۔ قومی ہمدردی اور اسلامی جوش کے وہ پیکر مجسم تھے۔ ان کی طبیعت میں استغنا اور خودداری کا خاص جوہر تھا۔ ان کے پہلو میں ایک غیور و فیاض دل تھا۔ ان کی تصانیف کا مقصد صرف قوم کا فائدہ تھا چنانچہ کثیر التعداد تصانیف میں سے جن میں سے اکثر کے کئی کئی ایڈیشن نکلے انہوں نے کوئی ذاتی فائدہ حاصل نہیں کیا یا تو انہوں نے مدرسۃ العلوم علی گڑھ کو یا ندوہ کو یا اپنے احباب کو اس کا حق تصنیف عطا کر دیا۔ ساتھ ہی اس کے وہ ایک عملی آدمی تھے محض باتیں بنانا اور تجویزیں سوچنا وہ نہیں جانتے تھے بلکہ وہ مسلمانوں کے مفید جو تجویز سوچتے تھے خود بھی

عملاً اس کام کوشروع کر دیتے تھے۔ انہوں نے جس کام کو ہاتھ میں لیا اس میں جان ڈال دی۔ انجمن ترقی ارو کے جب تک وہ سکریٹری رہے وہ زمانہ بھی اس کی رونق بہار کا رہا۔ ندوہ انہی کی ذات سے ندوہ ہوا۔ اس کے ہر صیغے میں جو کچھ ترقی ہوئی وہ مولانا ہی کی سعی وکوشش کا نتیجہ ہے۔

وقف علی الاولاد کے متعلق انہوں نے جو سعی مشکور کی وہ ایک ایسا احسان ہے جس کا نہ صرف موجودہ بلکہ آئندہ نسلیں بھی کسی طرح شکریہ ادانہیں کرسکتیں۔

انہوں نے ہی مدارس میں جو کتب درسیہ جاری ہیں اوران میں مسلمانوں کے متعلق جس قدر خلاف واقعہ بیانات ہیں ان کی جانب نہایت زور کے ساتھ توجہ دلائی جس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔

اردو کی حمایت ان کا ایک خاص مقصد تھا جس کا پتہ اگر ڈھونڈھنا ہے تو نہ صرف ان کی تصنیفات ہی کو دیکھنا چاہئے بلکہ اس کا پتہ گورنمنٹ کے کاغذات میں زیادہ تر ملے گا۔

اشاعت اسلام کے متعلق انہوں نے ایک نہایت عمدہ اسکیم تیار کی تھی مگر خرابی صحت کے سبب سے خود اس پرعمل پیرا نہ ہو سکے اور کوئی جماعت ایسی نہ تھی جو ان کی تجاویز کے مطابق عمل درآمد کرتی اس لیے افسوس ہے کہ وہ بارآور نہیں ہوئی۔ غرض ان کے کاموں کے متعلق یہ کہنا کسی طرح بے موقع نہ ہوگا۔

زفرقِ تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا این جاست

مولانا فطری شاعر تھے لیکن شاعری میں ایسا انہاک نہ تھا جو انسان کو دوسرے کام کا نہیں رکھتا البتہ دیگر علمی اشغال سے جو وقت فرصت بچتا تھا وہ شعر وشاعری میں صرف ہوتا تھا اور حقیقتاً ان کی تفریح کا مشغلہ یہی تھا۔ مولانا کی فارسی اور اردو شاعری کی جس قدر غزلیات اور نظمیں شائع ہوئی ہیں ان سے مولانا کی قادرالکلامی کا پتہ لگتا ہے۔ فارسی میں انکا کلام استادانہ ہوتا تھا، اردو میں ان کا ایک خاص رنگ تھا جس کا خاتمہ ان ہی پر ہو گیا۔ تاریخی واقعات اور مذہبی روایات کو انہوں نے جس خوبی، صفائی برجستگی اور شاعرانہ دل آویزی کے ساتھ نظم کیا ہے وہ ان ہی کا حصہ تھا۔

انہوں نے ان بابرکت مکتبوں میں ہی تعلیم پائی تھی جن مکتبوں نے سرسید، محسن الملک، وقار الملک، حالی، نذیر احمد، ذکاء اللہ خان جیسے بلند مرتبہ شاگرد پیدا کئے، جنہوں نے قوم کی حالت میں انقلاب عظیم پیدا کیا۔

شبلی نے چٹائی اور بے فرش کے تخت پر بیٹھ کر تکمیل تعلیم کی تھی لیکن اس خداداد قابلیت کی وجہ سے جو خاص ہی خاص دماغوں کو ملتی ہے اپنے آپ کو قدیم اور جدید دونوں اسکولوں کا ماسٹر تسلیم کرا لیا تھا۔ ان کی تحقیقات اور دقت نظری سے آج دونوں اسکولوں کے بڑے بڑے استاد اور ماسٹر فائدہ اٹھاتے ہیں۔

مرحوم کی زندگی اور ان کے شاندار کارناموں پر تبصرہ کرنا اسی شخص کا کام ہوگا جو خود انکی سیرۃ لکھنے بیٹھے گا اور وہی ان کی مختلف الحیثیت قابلیتوں کا موجودہ اور گذشتہ زمانہ کے فضلا سے پورا پورا موازنہ کر سکے گا ہم نے جو کچھ لکھا اور لکھ رہے وہ فقط اس درد کی ٹیس ہے جو دفعتاً ان کی موت سے ہمارے دل میں پیدا ہوا ہے۔ علامہ مرحوم کی خدمت میں ہم کو ۱۸۹۶ء سے نیاز حاصل تھا اور اس انیس برس کے عرصہ میں ہم کو بارہا ان کی صحبت اور خلوت وجلوت میں حاضری کا موقع ملا۔ بہت کم انسان ایسے ہیں جن کی پبلک اور پرائیویٹ لائف یکساں ہوتی ہے مگر شبلی کی دونوں قسم کی زندی یکساں تھی۔

ان کی سب سے آخری مگر سب سے بڑی علمی و مذہبی خدمت سیرۃ نبوی کی تدوین و تالیف تھی اور اس کے متعلق مرحوم کے دل میں جس قدر جوش تھا اس کے کچھ اندازہ کے لیے ہم اس موقع پر ایک خط کے اقتباس کو درج کر دینا ہی کافی جانتے ہیں جو مرحوم نے ۲ر نومبر ۱۹۱۲ء کو یعنی انتقال سے دو سال قبل ہم کو لکھنؤ سے تحریر فرمایا تھا۔

> ''لیکن اب روپیہ کا نہیں میری جان کا سوال ہے۔ ہر حالت میں کام جاری رکھوں گا اور اگر مر نہ گیا اور ایک آنکھ بھی سلامت رہی تو انشاء اللہ دنیا کو ایسی کتاب دے جاؤں گا جس کی توقع کئی سو برس تک نہیں ہوسکتی۔''

لیکن افسوس ابھی ایک ہی جلد (جس میں رسول مقبول صلعم کی زندگی کے سادہ حالات

ہیں) مکمل ہونے پائی تھی کہ مولانا نے داعی اجل کو لبیک کہا اور جان شیرین جان آفرین کے سپرد کی۔ مولانا نے وفات سے تھوڑی مدت پہلے ظل السلطان کے لیے ایک نظم 'نوجوانوں سے خطاب'' عنایت فرمائی تھی۔ اس نظم میں ایک دلی جذبہ کے اظہار اور بزرگانہ نصیحت کے علاوہ دنیا سے اپنے جلد رحلت کر جانے کی پیشین گوئی بھی ہے۔

کیے تھے ہم نے بھی کچھ کام جو کچھ ہم سے بن آئے
یہ قصہ جب کا ہے باقی تھا جب عہد شباب اپنا
اور اب تو سچ یہ ہے جو کچھ امیدیں ہیں وہ تم سے ہیں
جواں ہو تم ، لبِ بام آ چکا ہے آفتاب اپنا

انہوں نے اسلام کی اور مسلمانوں کی بڑی بڑی خدمتیں کی ہیں لیکن سیرۃ نبوی جوان کی آخری خدمت تھی وہ سب سے افضل، سب سے ممتاز اور سب سے اعلیٰ و ارفع تھی ان کو نہ صرف ادبی، تنقیدی لحاظ سے اپنی اس تصنیف پر فخر تھا بلکہ وہ اس کو اپنا خاتمہ بالخیر ہونے کی دلیل سمجھتے تھے۔ چنانچہ ان کا ایک قطعہ ہمارے اس قول کا شاہد ہے جس میں کوٹ کوٹ کر وہ جذبہ بھرا ہوا ہے جو ایک شیدائے اسلام ہی کے دل میں ہوتا ہے۔

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیمِ آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرۃ پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

مولانا کی موت کا خطرہ نہ صرف مولانا کو تھا بلکہ ایک اور بھی مقدس دل میں یہ خطرہ گذرتا تھا کہ مبادا مولانا رحلت کر جائیں اور یہ کام نا تمام رہ جائے۔ وہ دل کس کا تھا ہر ہائینس نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ تاج ہند، جی.سی.ایس.آئی.و جی.سی.آئی.ای فرمانروائے بھوپال دام اقبالہا کا دل تھا جو اسلام کے مقدس جذبات سے ہمیشہ مملو رہتا ہے۔

جس وقت مولانا نے الندوہ میں مالی امداد کی اپیل شائع کی اور سرکار عالیہ کی نظر اقدس

سے گذری تو فوراً حضور ممدوحہ کی توجہ اس طرف منعطف ہوئی۔ اور پھر مفصل تجویز طلب کرنے کے بعد حضور ممدوحہ نے تمام مصارف کی کفالت فرمائی کیونکہ ایسے باعظمت کام کے لیے دوسو روپیہ ماہانہ کی رقم حضور ممدوحہ کے نزدیک کوئی حقیقت نہ رکھتی تھی۔ اور پھر کیونکر حضور ممدوحہ کی حمیت اسلامی گوارا کرسکتی کہ آں حضرت صلعم کی سیرۃ کے لیے شبلی جیسا مصنف مصارف کے لیے پریشان ہو۔ حضور ممدوحہ نے حسب خواہش دوسال کے لیے منظوری صادر کی۔ لیکن ابتداء مولانا کو خود کام کی اس قدر وسعت معلوم نہ تھی جب شروع ہوا تو بجائے ایک جلد کے پانچ جلدوں کی ضرورت محسوس ہوئی اور تقریباً آٹھ سال کی مدت تکمیل کے لیے اندازہ کی گئی۔

مولانا بھوپال تشریف لائے، حضور ممدوحہ کی بارگاہ میں باریاب ہوئے اور ان تمام مراحل کو جو آیندہ پیش آنے والے تھے بیان کیا۔ حضور ممدوحہ نے اس امداد کو کامل مدت کے لیے جس کو مولانا نے عرض کیا وسیع فرمایا۔ مگر فرمایا کہ ''مجھے تو اس امداد کا جو کچھ ثواب حاصل ہونا تھا وہ حاصل ہوگیا لیکن آپ کی صحت جب اس درجہ خراب ہورہی ہے تو اس امر کا کیا اطمینان ہے کہ آپ کی زندگی اس کی تکمیل کے لیے وفا بھی کرے گی۔''

مولانا نے کہا ''خدا خود میر سامان است اسباب توکل را۔ میں اتنا مواد تو چھوڑ جاؤں گا کہ اگر قابل لوگوں کے ہاتھوں میں پڑا تو وہ اس کی تکمیل کردیں گے۔'' اور پھر مولوی حمید الدین اور مولوی سید سلیمان کا نام لیا۔

افسوس یہ خطرات پورے ہوئے اور صحیح نکلے۔ اور وہ علمی شمع جو قدیم مکاتب کے نام کو منور کرنے والی تھی خاموش ہوگئی۔ (۴۴)

اسی وفیاتی مضمون کے ساتھ انہوں نے سیرت نبوی کی تکمیل اور اس کے انتظامات پر بھی مضمون لکھا ہے اور ملک وملت اور ریاست بھوپال کی ملکہ معظّمہ کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ علامہ کی وفات کے بعد ان کے فاضل تلامذہ اس کو پورا کریں گے۔ وہ مضمون بھی منظر عام پر لانے کے لائق ہے۔ جو درج ذیل ہے:

تکمیل سیرۃ نبویؐ

۱۸؍نومبر کو شام کو مولانا شبلی کی رحلت کے مراسلۂ برقی نے دل وجگر پر جس طرح یاس و نا امیدی کی بجلی گرائی اس کا لفظوں میں کیونکر بیان کیا جائے، بہر حال یہ ایک سانحہ عظیم تھا جو ہوا، تار پڑھنے کے بعد گھنٹوں ایک غم انگیز حالت طاری رہی، دوسرے دن علیا حضرت سرکار عالیہ دام اقبالہا کے ملاحظہ میں وہ تار پیش کیا۔ حضور ممدوحہ کو ایسے جوہر قابل کے انتقال پر نہایت درجہ تاسف ہوا اور فوراً مجھ کو حکم ملا کہ بلا توقف اعظم گڑھ روانہ ہو جاؤں اور اس امر کا اطمینان کروں کہ مسودات محفوظ ہیں یا نہیں اور آئندہ کیا انتظام ہوگا اور مولانا مرحوم نے اس کے متعلق کیا وصیت کی ہے۔ حضور ممدوحہ نے اسی وقت نہایت جوش کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ ''یہ کام ضرور مکمل ہوگا خواہ کیسی ہی کچھ مشکلات کیوں نہ پیش آئیں۔'' چنانچہ میں ۲۰؍نومبر کو روانہ ہو کر ۲۱؍ کی صبح کو اعظم گڑھ پہونچا۔ یہ ۲۶؍گھنٹے کا راستہ کیونکر کٹا اور کیا بردانگیز خیالات دل میں پیدا ہوتے رہے نہ ان کو قلم لکھ سکتا ہے اور نہ زبان ادا کر سکتی، اعظم گڑھ سے دو اسٹیشن پہلے اتفاق سے مولوی حمید الدین صاحب اور مولوی سید سلیمان صاحب سے ملاقات ہوئی ایک نے دوسرے سے تعزیت کی اور دونوں نے مل کر آنسو بہائے۔ معلوم ہوا کہ مولانا نے زندگی سے مایوس ہوتے ہی تمام مسودات کو سربمہر کرا دیا تھا اور وصیت کی تھی کہ ''ان ہی دونوں کے سپرد یہ خزانہ بے بہا کیا جائے۔''

انتقال سے چار پانچ دن پہلے یہ دونوں صاحب اعظم گڑھ آ گئے تھے اور بستر مرگ پر مولانا کی آخری التجا ان دونوں سے یہی تھی:

''سب کام چھوڑ دو، سیرۃ، سیرۃ، سیرۃ''

ان دونوں نے اقرار کیا اور مولانا کی روح نے ایک حسرت و امید کے ساتھ فضائے دار فانی میں پرواز کی۔

میں دو دن اعظم گڑھ رہا اور تمام امور کی طرف سے مطمئن ہو کر واپس آیا پہلی جلد بالکل مکمل ہے جو اس رسالہ کے شائع ہوئے نے قبل پریس میں جا چکی ہے۔ باقی چار جلدوں میں سے

دو قریب بہ تکمیل ہیں اور دو کے متعلق بہت کچھ کام کرنا باقی ہے۔ان پانچ جلدوں کی تقسیم جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے اس طرح کی گئی ہے کہ پہلی جلد میں آن حضرت صلعم کے سادہ حالات زندگی ہیں، دوسرے میں آن حضرت صلعم کے تبلیغی حالات کا تذکرہ ہے اور اس امر کو دکھایا گیا ہے کہ بہ حیثیت ایک پیغمبر کے آپ کی کیا شان تھی، تیسری جلد کلام مجید کے متعلق ہے اور چوتھی جلد میں ان اعتراضات کے جوابات ہیں جو یورپ میں آن حضرت صلعم کے متعلق ہوئے ہیں۔ پانچویں جلد میں مستند اور صحیح معجزات کا بیان ہے۔

اب یہ کام جو کچھ کہ باقی ہے مولانا کے بھائی مولوی حمید الدین صاحب بی اے (جو اس وقت دارالعلوم حیدرآباد کے پرنسپل اور ایک فاضل اور عالم گریجویٹ ہیں) اور مولوی سید سلیمان صاحب (جن سے علمی دنیا پوری طرح روشناس ہے) کے ہاتھوں میں ہے اور ان ہی دونوں پر مولانا کا بھروسہ اور ان ہی دونوں کے ساتھ امید وابستہ تھی۔

مولوی حمید الدین صاحب ایک خاموش زندگی بسر کرنے والے بزرگ ہیں انہوں نے مولانا عبد الحی صاحب فرنگی محلی مرحوم اور علمائے قدیم سے کتابیں ختم کر کے بی اے کی ڈگری حاصل کی، وہ حافظ ہیں اور نو برس سے قرآن مجید ہی کی خدمت کر رہے ہیں، قرآن مجید کے اشکالات کے متعلق ان کے چھے رسالے عربی زبان میں شائع ہو چکے ہیں۔جس پر علمائے مصر نے حیرت ظاہر کی اور آج کل وہ حیدرآباد کی اس مشرقی یونیورسٹی کا جو عنقریب وہاں قائم ہونے والی ہے نظام مرتب کر رہے ہیں اور دارالعلوم کے پرنسپل کے عہدہ پر ممتاز ہیں، پانچ سو ماہوار تنخواہ ہے اور ایک ہزار تک ترقی ،مولوی سید سلیمان مولانا کے شاگرد اور کیسے شاگرد جن پر مولانا نے اپنے چالیس سال کی علمی کمائی صرف کی ہے اور ۱۵/سال کی عمر سے اس وقت تک ان کی تعلیم میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، قابل شاگرد میں بھی فاضل استاد کا پورا رنگ قدرت نے بھر دیا ہے اور امید ہے کہ تھوڑے دنوں میں اگر شبلی کا نعم البدل نہیں تو اس کا جانشین ہم کو ضرور مل جائے گا۔ وہ اس وقت پونہ کالج میں فارسی کے پروفیسر ہیں جہاں معقول تنخواہ ملتی ہے۔اور معقول ترقی کی امید ہے۔

یہ دونوں قابل احترام اصحاب اس بات پر قطعی آمادہ ہیں کہ سب کام چھوڑ کر تکمیل سیرۃ

کریں گے۔گذشتہ ہفتہ میں مولوی حمید الدین صاحب حیدرآباد جاتے ہوئے دو دن کے لئے ایڈیٹر ظل السلطان کے مہمان ہوئے اور مولانا سید سلیمان صاحب بھی دوسرے دن لکھنؤ سے جہاں وہ نامی پریس میں سیرت کے چھپنے کا انتظام کرنے گئے تھے بھوپال تشریف لائے اور یہ دونوں صاحب دوسرے دن حضور سرکار عالیہ کی بارگاہ میں سلام سے مشرف ہوئے، بہت دیر تک مولانا کے انتقال کا افسوس اور تکمیل سیرۃ کے انتظام کے متعلق تذکرہ ہوا حضور ممدوحہ نے نہایت حوصلہ افزائی فرمائی اور ارشاد کیا کہ ''صرف اسی کام کی تکمیل آپ دونوں کے ذمہ نہیں ہے بلکہ ابھی قوم اور اسلام کے لئے آپ دونوں کو بہت کچھ کرنا ہے۔'' اسی گفتگو کے دوران میں حضور ممدوحہ نے فرمایا کہ ''میں ہر قسم کی امداد دینے کے لئے تیار ہوں، آپ کام کیجئے اور کام کرنے والے آدمی مہیا کیجئے میری تو دلی تمنا ہے کہ میری قوم میں ایسے لوگ پیدا ہوں کہ جو علم و مذہب کی خدمت کریں'' غرض یہ دونوں صاحب یہاں سے ایک اور اثر لئے گئے، اور ۵/دسمبر کو حضور ممدوحہ نے بدستور امداد جاری رہنے کا فرمان صادر فرمایا۔

اس وقت تک جو حالات ہیں ان کے لحاظ سے امید ہے کہ باقی جلدوں کی بھی بہت جلد تکمیل ہو جائے گی اور پہلی جلد جو مکمل ہو چکی ہے اس کے لئے اب ملک کی نگاہیں منشی رحمت اللہ صاحب رعد کے مشہور نامی پریس کے دروازہ پر لگی رہیں گی۔(۴۵)

تعلیقات و حواشی:

(۱) آپ بیتی، مولانا عبدالماجد دریابادی، ص۲۱۳

(۲) ماہنامہ الناظر۔قسط اول: مارچ ۱۹۱۰ء ص۱۰-۳۱

قسط دوم: جنوری ۱۹۱۱ء، ص۱-۱۲ (تنقید الکلام کی اصلاح کے عنوان سے عطا محمد نے جولائی، ستمبر، نومبر ۱۹۱۰ء اور جنوری ۱۹۱۱ء میں اس کا جواب لکھا ہے۔)

(۳) علامہ شبلی انجمن ترقی اردو کے پہلے سکریٹری تھے اسی کی طرف اشارہ ہے۔اصلاً علامہ اس کے بنیاد گذار تھے۔علوی صاحب شاخوں کا ذکر کر رہے ہیں اور بنیاد کے پتھر سے صرف نظر

(۴) سیرۃ النبی کی ناتمامی کا ذکر ہے۔

(۵) علوی صاحب کو وضاحت کرنی چاہئے تھی کہ علامہ شبلی کیا ''مارنا چاہتے تھے۔افسوس یہ ہوتا ہے کہ کاکوری یعنی اودھ کا ہو کر بھی اس قدر خراب زبان استعمال کی ہے کہ اسے ادا کرتے نہیں بنتا۔

(۶) عقائد و عمل کی خرابیوں کی نشاندہی بھی کرنی چاہئے تھی، کہیں ایسا نہ ہو کہ علوی صاحب اس کو سمجھ ہی نہ ہو سکے ہوں۔

(۷) علامہ شبلی کن جھگڑوں میں مبتلا ہوئے۔؟ جھگڑے تو ان پر تھوپے گئے۔وہ تو ہمیشہ دفاع کرتے رہے، اگر وہ جھگڑا چاہتے تو مستعفی ہو کر وطن کیوں آتے ؟۔ابھی تو لڑنے جھگڑنے کے اور بھی مواقع تھے مگر انہوں نے استعفاء دیا اور اعظم گڑھ کی راہ لی اور برسوں کی کمائی ان کے حوالہ کر دی۔وہ اڑ جاتے تو اور کچھ بھلے ہی نہ ہوتا، ندوہ تقسیم ضرور ہو جاتا، جو علامہ شبلی کو گوارا نہ تھا۔

(۸) ماہنامہ الناظر لکھنو، دسمبر ۱۹۱۴ء ص ۶۷-۶۸

(۹) الہلال کلکتہ۔ ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء، سرورق

(۱۰) وفیات معارف ص ۱۶۷

؟(۱۱) سیرۃ النبیؐ

(۱۲) مخالف کا کچھ نام تو ہوگا۔

(۱۳) اہل علم محسوس کر سکتے ہیں جب تک ایک شہید علم کا تذکرہ تھا مولانا مرحوم کا کیا انداز تحریر تھا اور جب صاحب ثروت کا ذکر آیا تو کیسا ٹون بدل گیا۔

(۱۴) رسالہ اہل حدیث، امرت سر ۸ر محرم الحرام ۱۳۳۳ھ

(۱۵) رپورٹ آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۱۴ء، ص ۱۳۲-۱۳۳

(۱۶) رپورٹ آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۱۴ء، ص ۱۳۴

(۱۷) رپورٹ آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۱۴ء، ص ۱۳۴-۱۳۵

(۱۸) رپورٹ آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۱۴ء، ص ۱۶۹

(۱۹) نوادرات شبلی ص ۱۷۹-۱۸۰

(۲۰) روزانہ پیسہ اخبار، لاہور ۲۱/نومبر ۱۹۱۴ص ۱-۲

(۲۱) روزانہ، پیسہ اخبار لاہور، ۳۱/دسمبر ۱۹۱۴ء، ص ۵

(۲۲) روزانہ، پیسہ اخبار لاہور، ۳۱/دسمبر ۱۹۱۴ء، ص ۵

(۲۳) روزانہ، پیسہ اخبار لاہور، ۳۱/دسمبر ۱۹۱۴ء، ص ۵

(۲۴) روزانہ پیسہ اخبار، لاہور، ۱۵/جنوری ۱۹۱۵ء، ص ۱

(۲۵) تہذیب نسواں، لاہور، ۱۶/جنوری ۱۹۱۵ء ص ۳۵-۳۶

(۲۶) ایضاً

(۲۷) ایضاً

(۲۸) خطیب دہلی، ۷/جنوری ۱۹۱۵ء، ص ۱۲-۱۳]

(۲۹) دلگداز لکھنو، نومبر ۱۹۱۴ء، ص ۲۶۲-۲۶۳]

(۳۰) روداد جلسہ چہارم ص ۱۶ تا ۳۲ بحوالہ تاریخ ندوۃ العلماء ج ۲ ص ۱۰۹

(۳۱) روداد جلسہ چہارم ص ۱۶ تا ۳۲ بحوالہ تاریخ ندوۃ العلماء ج ۲ ص ۱۱۴

(۳۲) ماہنامہ زمانہ کان پور، جنوری ۱۹۱۵ء، ص ۷۰-۷۱

(۳۳) ماہنامہ زمانہ کان پور، جنوری ۱۹۱۵ء، ص ۱۶

(۳۴) ماہنامہ زمانہ کانپور، جنوری ۱۹۱۵ء، ص ۱۹-۲۲

(۳۵) ماہنامہ زمانہ کانپور، جنوری ۱۹۱۵ء، ص ۲۲

(۳۶) روزنامہ زمیندار، لاہور ۲۰/نومبر ۱۹۱۴ء

(۳۷) ایضاً

(۳۸) روزنامہ زمیندار لاہور ۲۰/نومبر ۱۹۱۴ء

(۳۹) کلیات اکبر حصہ سوم ص ۱۵۰، مطبع کریمی الہ آباد، ۱۹۴۰ء

(۴۰) کلیات عزیز، ص ۳۰۲، مطبع نامی لکھنو، ۱۹۳۱ء

(۴۱) کلیات عزیز، ص ۳۰۱، مطبع نامی لکھنو، ۱۹۳۱ء

(۴۲) ماہنامہ نظام المشائخ دہلی، جلد۱۲، نمبر۲۔ صفر المظفر ۱۳۳۳ھ، ص۵۲-۵۳

(۴۳) اخبار مخبر عالم، مراد آباد۔ ۸/دسمبر ۱۹۱۴ء

(۴۴) حوالہ: ظل السلطان۔ دسمبر ۱۹۱۴ء، صفحہ ۷۸-۸۴

(۴۵) ایضاً، ص: ۸۵-۸۸

بیان شبلی

ملازمت کی متنوع مصروفیات کے سبب مطالعہ وتحقیق کا کام کافی متاثر ہوا ہے۔اس لئے خیال تھا کہ شاید اب بیان شبلی کا سلسلہ رک جائے۔مگر اس دوران چند باتیں ایسی سامنے آ گئیں جن کا ذکر مطالعۂ شبلی میں ضروری معلوم ہوا،اسی خیال سے یہ معلومات درج کی جاتی ہیں۔

حضرت عمرؓ (حصہ اول)

مولانا سید علی حیدر [المتوفی:۱۶/رمضان المبارک ۱۳۸۰ھ]،مدیر ماہنامہ اصلاح کھجوہ ضلع سارن بہار نے یہ کتاب الفاروق کے رد میں لکھی ہے۔یہ اصلاح پریس کھجوہ ہی سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی ہے۔راقم کے پیش نظر طبع دوم ہے۔اور یہ ۲۰۸/صفحات پر مشتمل ہے۔

اس میں الفاروق پر جو اعتراضات وارد کئے گئے ہیں اگر ان کی تعداد اکائی یا دہائی میں رہتی تو اسے دکھانے اور جائزہ لینے کو کوشش کرتا،ان کی تعداد سیکڑوں میں ہے۔ممکن ہے فاضل مصنف کے نزدیک بہت اہم ہوں،لیکن ماضی میں اہل تشیع نے حضرت عمرؓ اور اور سنیوں پر جو ناروا اعتراضات کئے ہیں انہی سے یہ کتاب بھری پڑی ہے۔اس کا مطالعہ و جائزہ بھی چنداں مفید نہیں بلکہ مناظرہ ومباحثہ کی راہ کھل جائے گی۔قوم جس کی اب متحمل نہیں۔

پہلے حصہ کے اختتام پر دوسرے حصہ کے جلد شائع کئے جانے کا اعلان کیا گیا ہے۔معلوم نہیں کہ وہ شائع ہوا یا نہیں۔ناچیز نے مولانا علی حیدر کی تصنیفات میں اسے تلاش کیا مگر اس کا اندراج کہیں نظر نہیں آیا۔

عربی مرثیہ کی مختصر تاریخ

موازنہ انیس ودبیر کے رد میں جو کتابیں لکھی گئیں ان کا ذکر آثار شبلی میں آچکا ہے، یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے مگر ناچیز کو اس کا علم نہیں تھا۔حال میں یہ کتاب دریافت ہوئی ہے۔

موازنہ انیس ودبیر میں علامہ شبلی نے تسلسل کے لئے ایک جملہ میں عربی مرثیہ کا ذکر کر دیا تھا، ظاہر ہے موقع ومحل کے لحاظ سے اس میں عربی مرثیہ کی تاریخ لکھی نہیں جاسکتی تھی۔مشہور شیعہ عالم علامہ سید سبط الحسن فاضل ہنسوی نے اسے موازنہ کی ایک کمی بتا کر یہ کتاب ''عربی مرثیہ کی مختصر تاریخ''لکھی ہے۔جسے سید آفاق حسین رضوی آنریری امامیہ مشن لکھنو نے شائع کیا ہے۔

مصنف اس کا سبب تصنیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''عرصہ ہوا کہ شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی نے ادبی تنقید کی معرکہ آرا کتاب ''موازنہ انیس ودبیر'' لکھ کر شائع کی۔اس کتاب کے شروع میں مصنف نے ''مرثیہ گوئی کی اجمالی تاریخ''لکھی ہے۔اس سلسلہ میں کربلا کے قیامت خیز واقعے کا ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ ''یہ ایک ایسا واقعہ تھا کہ اگر عرب کے اصلی جذبات موجود ہوتے تو اس زور کے مرثیے لکھے جاتے کہ تمام دنیا میں آگ لگ جاتی۔لیکن ادھر تو عرب کے پرزور جذبات میں انحطاط آچکا تھا ادھر بنوامیہ کی ظالمانہ سطوت اور جباری نے تمام شعرا کی زبانیں بند کر دی تھیں۔''
>
> اس عبارت سے عام طور پر یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی کہ عربوں نے واقعہ کربلا کے متعلق مرثیے نہیں کہے۔اور عربی ادب کا خزانہ اس صنف نظم سے بالکل خالی ہے۔بعض لوگوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ عربوں نے اس واقعے پر مرثیے کہے تو لیکن کسی بڑے شاعر نے کوئی بلند پایہ مرثیہ نہیں کہا اور یہی غالبًا مولوی شبلی کا مقصد تھا۔چنانچہ مولوی امیر احمد صاحب علوی اپنی قابل قدر

کتاب ''یادگار انیس''، میں لکھتے ہیں کہ

۱۔کربلا کے محشر خیز ظلم پر کوئی مرثیہ ایسا نہیں کہا گیا کہ زندہ رہتا۔

۲۔اس زمانہ کے کسی مشہور شاعر نے واقعہ کربلا نظم کرنے کی جرات نہیں کی۔

۳۔اور عرب شاعری بیان مصائب اہل بیت کی سعادت سے محروم رہی۔

۴۔بنی عباس کے عہد میں بعض غیر مشہور شعرا نے متفرق اشعار واقعہ کربلا کے متعلق کہے۔

۵۔اور دعبل خزاعی نے ایک طویل مرثیہ لکھا جس کی شہرت کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ امام علی رضا علیہ السلام کے حضور میں پڑھا گیا اور اثر و جوش کا اس میں پتہ نہیں۔

۶۔ بلکہ اسی زمانہ میں برامکہ کے قتل پر جو دردناک مرثیے کہے گئے تھے ان سے اس سرمایہ ناز و افتخار دعبل کو کچھ نسبت نہیں۔

(یادگار انیس مولفہ امیر احمد علوی ص۴-۵)

''مندرجہ بالا اقتباسات کا لوگوں پر کیا اثر پڑا ہے اس کو میں ایک واقعہ سے واضح کر دینا چاہتا ہوں۔میں جس زمانے میں ایوینگ کرسچین کالج الہ آباد میں معلم تھا،الہ آباد یونیورسٹی کے اسکالر مسٹر ہری ہر سہاے ایم اے نے ''موازنہ انیس و دبیر'' کو پڑھنے کے بعد مجھ سے یہ دریافت کیا تھا کہ ''کیا مولانا شبلی کا یہ بیان صحیح ہے کہ عربی شاعری میں واقعہ کربلا پر مرثیہ نہیں لکھا گیا۔؟ اگر واقعی عربی ادب امام حسین کے مرثیوں سے خالی ہے تو کیا اس کا سبب یہ نہیں ہوسکتا کہ سانحہ کربلا کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ ورنہ شعراے عرب ضرور مرثیہ کہتے۔ع

منم کردہ ام رستم داستاں!

میں نے اس وقت اپنے ہندو دوست کو حقیقت حال سے آگاہ کیا
جس سے ان کو تسکین ہوگئی۔لیکن شبلی اوران کے ہم خیال مصنفین کی تحریروں
سے یہ ایک عام غلط فہمی پیدا ہوگئی ہے۔ضرورت ہے ہمارے ادبا و ناقدین اس
کی طرف متوجہ ہوں اوراس غلط فہمی سے واقعہ کربلا کی اہمیت کو نقصان پہنچنے
کا جو شدید اندیشہ پیدا ہوگیا ہے اس کو دور کرنے کی کوشش کریں۔اس سلسلہ
میں بحمدہ میں نے کافی موادفراہم کیا ہے۔''

(عربی مرثیہ کی مختصر تاریخ ص۴-۵)

۹۶رصفحات کی یہ کتاب اسی سوال کے جواب پر مشتمل ہے۔اس میں جابجا مصنف نے علامہ شبلی کی تنقید کے ساتھ بعض تنقیص بھی کی ہے۔بہر کیف یہ کتاب بھی موازنہ کی بدولت وجود میں آئی اور بہت اہم مواد پر مشتمل ہے۔

شعرالعجم حصہ اول کا خلاصہ

شعرالعجم کی متعدد تلخیصات کا ذکر بیان شبلی اورراقم کی دوسری تصنیفات میں آچکا ہے۔ حال میں اس کے اول ودوم حصوں کی تلخیصات دستیاب ہوئی ہیں۔حصہ اول کی تلخیص حافظ قاری مولانا مولی بشیرالدین احمد مجددی بشیر کے قلم سے ہے۔موصوف کئی کتابوں ایجاز الصرف، ایجاز النحو اور مخزن الفراید کے مصنف ومولف ہیں۔۶۴رصفحات پر مشتمل یہ تلخیص ۱۹۲۵ء میں شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور نے شائع کیا ہے۔فاضل مولف نے شعرالعجم حصہ اول کے تمام اہم مباحث کی تلخیص پیش کی ہے۔آخر میں مصنف شعرالعجم علامہ شبلی کے انتہائی مختصر حالات قلم بند کئے ہیں۔اس میں مولف سے دوسہو ہوئے ہیں۔ایک یہ کہ علامہ شبلی ۱۸۸۲ء میں علی گڑھ سے وابستہ ہوئے، جبکہ صحیح یہ ہے علامہ فروری ۱۸۸۳ء میں ایم اے او کالج علی گڑھ

سے وابستہ ہوئے تھے۔

دوسرے یہ کہ علامہ شبلی ندوہ کے آنریری سکریٹری تھے، یہ بھی صحیح نہیں وہ ندوہ کے معتمد تعلیم تھے۔

اس تلخیص کا انتساب مولف نے مولانا سید اولاد حسین شاداں بلگرامی کے نام کیا گیا ہے۔آخری صفحہ پر دوقطعات تاریخ ہیں ایک مولف کے قلم سے ہے جبکہ دوسرا حافظ ابوالفتح محمد عبدالحفیظ خاں مونس کا نتیجہ فکر ہے۔(ص ۶۴)

تلخیص الاتم

یہ شعرالعجم حصہ دوم کا خلاصہ ہے۔اور منشی غلام احمد خاں صاحب منشی فاضل رامپوری شادانی کے قلم سے ہے۔ فاضل مرتب نے شعرالعجم کی یہ تلخیص بھی شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور کی خواہش پر کی ہے اور انہی نے ۱۹۲۳ء میں مطبع کریمی لاہور سے اسے طبع بھی کرایا ہے۔ مولف نے لکھا ہے کہ

> ''مرزا محمد تقی عرف ببن سلمہ ولد مرزا محمد زکی صاحب مرادآبادی وکیل ریاست رام پور کو جب میں تعلیم نصاب امتحان منشی عالم پنجاب یونیورسٹی دے رہا تھا اور یہ شعرالعجم داخل نصاب ۱۹۲۳ء تھی تو حقیر نے ببن سلمہ کے لئے اس جلد کا خلاصہ تیار کیا لیکن اس کی تمہید کا خلاصہ نہیں کرنے پایا تھا کہ ببن سلمہ جناب استادی مولوی سید اولاد حسین صاحب شاداں بلگرامی کے ساتھ جبکہ مولوی صاحب موصوف اورینٹل کالج لاہور میں سینئر پروفیسر ہوکر رام پور سے لاہور تشریف لے گئے تو ببن سلمہ بھی ان کے ہمراہ ۱۵ ستمبر ۱۹۲۳ء کو اورینٹل کالج لاہور میں تعلیم پانے کے لئے گئے اور تمہید کا خلاصہ رہ گیا۔ چونکہ شیخ مبارک علی صاحب بک سیلر اندرون لوہاری دروازہ لاہور نے اس خلاصہ کی طباعت کا

ارادہ ظاہر کیااس لئے خود مرزا محمد نقی عرف ببن نے تمہید کا خلاصہ اس میں شامل کر کے جناب شیخ صاحب کو برائے طبع دیدیا۔اوراس طرح یہ خلاصہ مکمل ہوگیا۔اگر چہ یہ خلاصہ خاص ببن کے لئے لکھا گیا ہے لیکن بعد طبع امیدواران امتحان منشی، عالم کے لئے ضرور مفید ثابت ہوگا۔کیونکہ میں نے بہت عرق ریزی سے خلاصہ کیا ہے۔''(تلخیص الاتم،ص:۲-۳)

فاضل مرتب نے بڑی محنت اور دیانت سے تلخیص کا کام کیا ہے۔کوشش کی گئی ہے کہ کوئی اہم پہلونظرانداز نہ ہونے پائے۔سعدی،امیرخسرو اور حافظ وغیرہ کی تلخیصات میں مرتب نے خاصی محنت کی ہے۔اور یہ آج بھی مفید معلوم ہوتی ہے۔

حصہ دوم کی یہ تلخیص ۵۲ رصفحات پر مشتمل ہے۔اور یہی اختصار اس کی بڑی خوبی ہے۔ جن لوگوں کو اصل اور مفصل کتاب پڑھنے میں دشواری ہوانہیں ان تلخیصات کا مطالعہ ضرور کر لینا چاہئے۔

الایجاز

یہ''شعرالعجم''حصہ پنجم کا خلاصہ ہے۔مولوی وجاہت حسین عندلیب منشی فاضل صدیقی، شادانی رام پوری نے یہ خلاصہ تیار کیا ہے۔۳۶ رصفحات پر مشتمل ہے۔شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور نے شائع کیا ہے۔طبع دوم جو۱۹۲۵ء میں طبع ہوا حال میں دریافت ہوا ہے۔مزید تفصیل درج نہیں ہے۔

•••

کتابیات

کتابیات

کتب

- آپ بیتی ۔مولانا عبدالماجد دریابادی، مکتبہ فردوس لکھنو، ۱۹۸۹ء
- آثار شبلی ۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۳ء
- الایجاز خلاصہ شعرالعجم حصہ پنجم، مولوی وجاہت حسین عندلیب صدیقی شادانی رامپوری، شیخ مبارک لاہور، طبع دوم ۱۹۲۵ء
- التلخیص الاتم من شعرالعجم، خلاصہ حصہ اول ۔حافظ قاری مولوی بشیر احمد بشیؔر مجددی، شیخ مبارک لاہور، ۱۹۲۵ء
- انتخاب مضامین شبلی ۔رشید حسن خاں، مکتبہ جامعہ دہلی، ۲۰۱۱ء
- اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر ۔علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۹ء
- بیان خسرو ۔علامہ شبلی نعمانی ۔الناظر پریس لکھنو
- بیان شبلی حصہ اول، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۲۰ء
- تاریخ ندوۃ العلماء (حصہ اول ودوم) مجلس صحافت ونشریات لکھنو، ۲۰۱۱ء
- تذکرہ علمائے اعظم گڑھ، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، مرکز دعوت وتحقیق دیوبند ۲۰۱۲
- تصانیف شبلی کے تراجم، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۲۱ء
- تلخیص الاتم خلاصہ شعرالعجم حصہ دوم ۔منشی غلام احمد خاں رامپوری شادانی، شیخ مبارک لاہور، طبع اول: ۱۹۲۳ء

- تنقید شعر العجم ۔ حافظ محمود شیرانی، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۴۲ء
- حیات خسرو، علامہ شبلی نعمانی، ادبی پریس لکھنو، ۱۹۲۲ء
- حیات شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی، دار المصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء
- خطوط شبلی ۔ منشی محمد امین زبیری، ظل السلطان، بھوپال [ب ت]
- خطوط شبلی بنام آزاد ۔ سید محمد حسنین، بہار اردو اکادمی پٹنہ، ۱۹۸۸ء
- دیوان وحشت ۔ سید رضا علی وحشت، مطبع ستارہ ہند کلکتہ
- ذکر فراہی ۔ ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، دائرہ حمیدیہ سرائے میر، ۲۰۰۱ء
- رپورٹ آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۰۸ء
- رپورٹ آل انڈیا محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۱۴ء
- رپورٹ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، ۱۹۱۱ء
- رشید حسن خاں تحریروں کے آئینے میں، حصہ دوم، ابراہیم افسر، کتابی دنیا دہلی ۲۰۲۰ء
- روداد اجلاس دوازدہم ندوۃ العلماء ۱۹۱۰ء
- روداد جلسہ انتظامیہ مدرسۃ الاصلاح ۔ ۱۹۱۰ء
- روداد جلسہ انتظامیہ مدرسۃ الاصلاح ۔ جون ۱۹۱۵ء
- روداد جلسہ انتظامیہ مدرسۃ الاصلاح ۔ یکم فروری ۱۹۱۶ء
- روداد جلسہ سالانہ مدرسۃ الاصلاح ۔ ۱۹۱۳ء
- سفر نامہ روم و مصر و شام ۔ علامہ شبلی نعمانی، دار المصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء
- سیرۃ النبی اول ۔ علامہ شبلی نعمانی، دار المصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۴ء
- شبلی اور جہان شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء
- شبلی خود نوشتوں میں ۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۹ء
- شبلی سخنوروں کی نظر میں، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء
- شبلی شناسی کے اولین نقوش، ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی، دار المصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۶ء

- شعرالعجم (اول تا پنجم)۔علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ،۲۰۱۸ء
- شبلی کے نام اہل علم کے خطوط۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۱۳
- عربی مرثیہ کی مختصر تاریخ۔سید آفاق حسین رضوی، امامتیہ مشن لکھنو
- فن تضمین نگاری: تنقید و تجزیہ۔ڈاکٹر شیخ عقیل احمد، ساقی بک ڈپو دہلی،۲۰۰۱ء
- قد اور سائے۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۱۹ء
- کتابیات شبلی۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ،۲۰۱۳ء
- کلام حکیم۔خلیفہ عبدالحکیم، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور،۱۹۷۳ء
- کلام شبلی کے اعلام واشخاص۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۲۰ء
- کلیات اکبر، حصہ سوم۔اکبرالہ آبادی، مطبع کریمی الہ آباد،۱۹۴۰ء
- کلیات شبلی اردو۔مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ،۲۰۱۲ء
- کلیات عزیز۔خواجہ عزیزالدین عزیز، مطبع نامی کان پور،۱۹۳۱ء
- متعلقات شبلی۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، طبع دوم۔۲۰۱۱ء
- مدرسۃ الاصلاح کے فضلاء کی قرآنی خدمات۔ابوسفیان اصلاحی، کے اے نظامی مرکز علوم القرآن۔علی گڑھ،۲۰۱۹ء
- مراسلات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ،۲۰۱۶ء
- مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں علامہ شبلی کا حصہ۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ۔۲۰۲۱ء
- مقالات رشید حسن خاں جلد اول، ٹی. آر. رینا، اپلائڈ بکس دہلی،۲۰۱۶ء
- مکاتیب شبلی (اول ودوم)۔سید سلیمان ندوی۔دارالمصنّفین اعظم گڑھ،۲۰۱۰ء
- مکتوبات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ،۲۰۲۱ء
- موازنہ انیس ودبیر۔علامہ شبلی نعمانی، مرتبہ رشید حسن خاں، مکتبہ جامعہ دہلی،۱۹۸۹ء
- نغمات نور۔نور لدھیانوی، جعفریہ بک ایجنسی، لاہور،۱۹۴۱ء

- نقوش شبلی۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ،۲۰۲۰ء
- نوادرات شبلی۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۷ء
- وفیات معارف، محمد سہیل شفیق، قرطاس کراچی،۲۰۱۳ء
- یادرفتگاں۔مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ،۱۹۹۲ء
- یگانہ روزگار مولانا عبدالسلام ندوی۔ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، طبع اول ۲۰۱۴ء

رسائل

- ماہنامہ افتخار، جاورہ، نومبر ۱۹۱۴ء
- اہل حدیث امرت سر: ۸/محرم ۱۳۳۳ھ
- الاصلاح سرائے میر، ماہنامہ: اگست ۱۹۳۶ء
- الناظر لکھنو، ماہنامہ: مارچ، جولائی، ستمبر، نومبر ۱۹۱۰ء، جنوری ۱۹۱۱ء، دسمبر ۱۹۱۴ء
- الندوہ لکھنو، ماہنامہ جولائی ۱۹۰۴ء، اپریل ۱۹۱۰ء
- الہلال کلکتہ ہفت روزہ: ۱۸/نومبر ۱۹۱۴ء
- اولڈ نوائے علی گڑھ، ماہنامہ: فروری ۱۹۱۳ء
- پیسہ اخبار لاہور: ۱۱/اپریل ۱۹۱۴ء، ۱۷/اکتوبر ۱۹۱۴ء، ۲۱/نومبر ۱۹۱۴ء، ۳۱/دسمبر ۱۹۱۴ء، ۱۵/جنوری ۱۹۱۵ء
- ماہنامہ تمدن دہلی، اپریل ۱۹۱۳ء
- تہذیب نسواں، ماہنامہ: جنوری ۱۹۱۵ء
- خطیب دہلی، ماہنامہ: جنوری ۱۹۱۵ء
- دلگداز لکھنو، ماہنامہ: نومبر ۱۹۱۴ء
- دکن ریویو حیدرآباد، ماہنامہ: فروری ۱۹۰۷ء

- ماہنامہ ظل السلطان، بھوپال، دسمبر ۱۹۱۴ء
- زمانہ کان پور، ماہنامہ: جنوری ۱۹۱۵ء
- زمیندار لاہور، روزنامہ: ۲۰ر نومبر ۱۹۱۴ء، ۲۷ر نومبر ۱۹۱۴ء
- اخبار مخبر عالم، مرادآباد۔ ۸ر دسمبر ۱۹۱۴ء
- معارف اعظم گڑھ، ماہنامہ: فروری ۱۹۸۰ء، جنوری ۲۰۲۰ء، نومبر ۲۰۲۱ء
- نظام المشائخ دہلی، ماہنامہ: جولائی ۱۹۱۳ء، رمضان ۱۳۲۹ھ، شعبان ۱۳۳۱ھ محرم ۱۳۳۲ھ، ربیع الثانی ۱۳۳۲ھ، جمادی الاول ۱۳۳۲ھ، رجب ۱۳۳۲ھ، صفر ۱۳۳۳ھ

اشاریہ بیان شبلی

(۲)

مرتبہ

مولانا محمد عرفات اعجاز اعظمی

استاد: دارالعلوم گورکھپور

•••

اشخاص

کتب ورسائل

مقامات

○○○

مصنف کی چند اور مطبوعات

۱۔ اسہل التجوید	2017	52	Rs:40/-
۲۔ علم الترتیل	1996	40	Rs:12/-
۳۔ تذکرۃ القراء	2012	216	Rs:250/-
۴۔ علامہ سید سلیمان ندوی بحیثیت مورخ	2014	124	Rs:130/-
۵۔ دارالمصنّفین کی تاریخی خدمات	2002	384	
۶۔ اشاریہ ماہنامہ الرشاد اعظم گڑھ	2004	232	Rs:150/-
۷۔ عظمت کے نشاں	2010	264	Rs:250/-
۸۔ ساحلوں کے شہر میں (سفرنامہ ممبئی)	2019	60	Rs:100/-
۹۔ شاہ معین الدین احمد ندوی حیات وخدمات	2007	190	
۱۰۔ متعلقات شبلی	2011	208	Rs:120/-
۱۱۔ مطالعات ومشاہدات	2010	240	Rs:250/-
۱۲۔ کتابیات شبلی	2011	271	Rs:250/-
۱۳۔ شبلی سخنوروں کی نظر میں	2012	312	Rs:300/-
۱۴۔ مکتوبات شبلی	2021	384	Rs:400/-
۱۵۔ کتابیں حصہ اول	2012	240	Rs:200/-
۱۶۔ کتابیں حصہ دوم	2013	240	Rs:250/-
۱۷۔ آثار شبلی	2013	752	Rs:500/-
۱۸۔ یگانہ روزگار مولانا عبدالسلام ندوی	2014	200	Rs:250/-
۱۹۔ علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط	2013	236	Rs:240/-
۲۰۔ عکس واثر	2013	208	
۲۱۔ شبلی شناسی کے سو سال	2014	260	Rs:350/-
۲۲۔ کتابیات مجیب	2014	192	Rs:250/-
۲۳۔ شذرات شبلی	2014	264	Rs:220/-
۲۴۔ قرائے عظام کے علمی ودینی کارنامے	2014	104	Rs:100/-

۲۵۔ اقبال اود بستان شبلی	2015	200	
۲۶۔ شبلی اور جہان شبلی	2015	208	Rs:250/-
۲۷۔ مراسلات شبلی	2016	154	Rs:150/-
۲۸۔ نوادرات شبلی	2017	256	Rs:400/-
۲۹۔ شبلی خود نوشتوں میں	2018	312	Rs:400/-
۳۰۔ علامہ شبلی کی تعزیتی تحریریں	2019	96	Rs:180/-
۳۱۔ قد اور سائے	2019	296	Rs:200/-
۳۲۔ نقوش شبلی	2020	320	
۳۳۔ کلام شبلی کے اعلام واشخاص	2020	184	Rs:300/-
۳۴۔ بیان شبلی حصہ اول	2020	208	Rs:300/-
۳۵۔ تصانیف شبلی کے تراجم	2021	224	Rs:400/-
۳۶۔ علامہ شبلی کے فارسی خطوط: ایک مطالعہ	2022	128	Rs:150/-
۳۷۔ کاروان رفتگاں	2008	272	Rs:200/-
۳۸۔ متاع رفتگاں	2015	211	Rs:200/-
۳۹۔ خطبات شبلی۔نو دریافت	2021	148	Rs:160/-
۴۰۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس میں علامہ شبلی کا حصہ	2021	304	Rs:350/-
۴۱۔ تاریخ اعظم گڑھ	2011	160	Rs:120/-
۴۲۔ رحمت عالم (ہندی ترجمہ)	2016	126	Rs:60/-
۴۳۔ اسفار مجیب	2014	296	
۴۴۔ کلیات نشور واحدی۔حصہ غزلیات	2016	604	Rs:500/-
۴۵۔ محبت نامے	2017	304	Rs:300/-
۴۶۔ انجمن ترقی اردو میں علامہ شبلی کا حصہ	2021	230	
۴۷۔ حرف واثر	264	350	
۴۸۔ افادات شبلی	224	350	
۴۹۔ شبلی کے مکتوب الیہ	208	350	

BAYAN-E-SHIBLI–2

by

Dr. Mohammad Ilyas Azmi

بات شبلی کے نصیب کی تھی جس نے پوری صدی کو شبلی کی عمل داری میں لادیا، لیکن شبلی کا فیضان رکنے والا کہاں تھا، صدی کے ختم ہوتے ہوتے، شبلی کی ملت میں ایک مجدد نے ظہور کیا، جس نے اپنے لیے صرف ایک جزیرہ کا انتخاب کیا۔ ایسا جزیرہ جو شبلی کا تنہا اور کامل، جلوہ گاہ ثابت ہو۔ دیکھتے دیکھتے اس جزیرۂ شبلی سے حیات شبلی کے سمندر کی ہر موج ٹکرانے لگی، نتیجے میں اس بحر کی تہہ سے خدا جانے کتنے ہیرے موتی اچھل کر جزیرے کو بیش بہا خزانے میں بدلنے لگے۔

جب الیاس صاحب کے قلم سے شروع میں شبلی پر چھوٹے چھوٹے مضامین آئے تو ان کے احباب اور ہم نشینوں کا کیا ذکر خود الیاس صاحب کے عالم خیال میں بھی یہ لمحہ نہیں گزرا ہوگا کہ یہ نوزائیدہ قلم ایک دن پچاسوں ضخیم اور وقیع کتابوں کے حق ملکیت کا تنہا دعویدار ہوگا۔ ان کی کتابوں پر کتابیں آتی رہیں، مضامین نو کے انبار لگتے رہے اور نگاہیں خیرہ ہوتی رہیں کہ شبلی کی جہاں گیری کی تمام وسعتوں اور مدفون خزینوں کی یافت اور حصول کی یہ کون سی کنجی، ان کے ہاتھ لگی۔ کوئی تو گوشہ چھوٹتا، جہاں شبلی کو ان کی آہٹ محسوس نہ ہوتی۔ اب یہ شبلی کا فیضان ہے یا الیاس صاحب پر شبلی کے خالق کا احسان کہ جو کام کئی انجمنوں اور پچاسوں محققوں کے بس کا نہ تھا وہ شبلی کے ایک گوشہ نشیں نام لیوا سے لے لیا گیا۔ سلام علی الیاسین۔

عمیر الصدیق ندوی

ISBN 978-93-90533-02-2

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
New Delhi , INDIA

978- 93- 90533- 02- 2
www.ephbooks.com